مئی
۲۰۱۱ء

اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

# ماہنامہ البرہان

جلد۲۱، شمارہ ۵ مئی ۲۰۱۱ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ

## مشمولات


| | | |
|---|---|---|
| البرہان کے قارئین کی خدمت میں | سراج محمود ناصر | ۲ |
| **O پاکستانی معاشرہ** | | |
| پاکستان میں تعلیمی وسماجی تحریک کی ضرورت | ڈاکٹر محمد امین | ۳ |
| امریکی غلامی سے اللہ کی پناہ | مدیر | ۵ |
| **O تزکیۂ نفس** | | |
| خودنمائی وخود بینی — مضرات وعلاج | احمد جاوید | ۶ |
| فکرِ آخرت | احمد جاوید | ۱۲ |
| **O دینی تعلیم** | | |
| دینی مدارس میں تدریس فقہ واصول فقہ | مفتی عبدالقدوس ترمذی | ۱۶ |
| دینی مدارس اورعصری تعلیم | ڈاکٹر محمد امین | ۲۵ |
| **O جدید تعلیم** | | |
| بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۲) | ڈاکٹر محمد امین | ۲۹ |
| **O میڈیا** | | |
| دینی طبقہ پرنٹ میڈیا کو کیسے استعمال کرے؟ | محمد عاصم حفیظ | ۳۹ |
| **O تفہیم مغرب (ڈائیلاگ)** | | |
| مسلم ترقی کے لیے مغربی سائنس وٹیکنالوجی ناگزیر ہے | حمیرا رانا | ۴۵ |
| مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں | سہیل احمد | ۴۷ |
| **O ملی مجلس شرعی** | | |
| انتخابات، قراردادیں اور کمیٹیاں | ادارہ | ۴۸ |
| O مدیر کے نام | ادارہ | ۵۲ |
| O اطباء اور طبی اداروں کی توجہ کے لیے | ادارہ | ۵۳ |
| O فہرست تالیفات ڈاکٹر محمد امین | ادارہ | ۵۴ |

# البرہان کے قارئین کی خدمت میں

البرہان کے مضامین پر تبصرہ آپ کا حق اور ہماری ضرورت ہے۔ جب تک آپ کمزور مضامین پر تنقید نہ کریں، اچھے مضامین کو نہ سراہیں اور پرچے میں جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں اس سے ہمیں آگاہ نہ کریں تو ہم اسے بہتر نہیں بنا سکتے لہٰذا بلا تکلف قلم اٹھائیے اور اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

اب جبکہ البرہان کا مزاج اور دلچسپی کا دائرہ اہل علم وفضل کے سامنے آچکا ہے کہ اسے جدید اور دینی تعلیم، تربیت وتزکیہ، میڈیا، مغربی تہذیب کی تفہیم اور ردّ اور فرد و معاشرہ کی اصلاح سے دلچسپی ہے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ البرہان کے لیے لکھیں۔ ظاہر ہے کہ ان امور میں البرہان کی ایک رائے ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ رائے اس طرح حرف آخر نہیں ہے جس طرح قرآن وسنت حرف آخر ہیں بلکہ یہ ایک انسانی کاوش ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے اور جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ آپ البرہان کی پالیسی کی حمایت ہی میں لکھیں بلکہ آپ اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور اگر آپ کا اختلافی نقطۂ نظر شائستگی، متانت اور دلائل پر مبنی ہوا تو البرہان اسے شائع کرنے میں نہیں ہچکچائے گا بلکہ ہم تو آپ سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ آپ پرچے اور اس کے علمی و اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے موزوں مضامین کی تلاش و انتخاب میں ادارتی عملے کی رہنمائی و معاونت فرمائیں۔

اگر پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی نہیں ہے تو ازراہ کرم ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ یہ کسی موزوں تر فرد تک پہنچ سکے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ پرچہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے تو بھی ہمیں اپنی دلچسپی سے آگاہ فرمائیں ورنہ اس کی فراہمی کسی بھی وقت معطل ہوسکتی ہے۔ اور اگر آپ پرچہ اپنے کسی دوست یا عزیز کو بھجوانا چاہتے ہیں تو بھی ہمیں اس کے ایڈریس سے مطلع فرمائیں۔

نیز اگر آپ چاہتے ہیں کہ البرہان جاری رہے تو اس کی انتظامیہ کا مالیات میں ہاتھ بٹائیں۔ خود بھی خریدار بنیں اور اپنے احباب کو بھی توجہ دلائیں۔ جزاکم اللہ خیرا۔

سراج محمود ناصر
مدیر انتظامی امور

پاکستانی معاشرے کا بحران اور اس کا حل (آخری قسط) ڈاکٹر محمد امین

# پاکستان میں تعلیمی، اخلاقی اور سماجی تحریک کی ضرورت جو غیر سیاسی ہو

ہم نے البرہان کے مارچ اور اپریل ۲۰۱۱ء کے شماروں میں مذکورہ بالا موضوع پر سیر حاصل بحث کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۔ پاکستانی معاشرہ جس بحران کا شکار ہے وہ ہمہ جہتی ہے: دینی و اخلاقی، سیاسی و معاشی، تہذیبی اور معاشرتی۔۔۔

۔ حکمران سیاسی قوتیں شعوری و لاشعوری دونوں سطحوں پر اس بحران کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں کیونکہ اپنے ذاتی و گروہی مفادات کے لیے اقتدار انہیں بہرحال چاہیے اور اس کے لیے وہ اسلام، مسلم اور پاکستان دشمن مغربی اقوام کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ اس پر عمل کررہی ہیں ــــ اور مستقبل میں بھی ان کے اس روش سے باز آنے کے امکانات نظر نہیں آتے کیونکہ وہ مذکورہ مغربی طاقتوں کے ایما اور مدد سے پاکستانی عوام کو جاہل رکھنے اور بیوقوف بنانے میں کامیاب ہیں۔

۔ دینی سیاسی قوتیں منتشر اور کمزور ہیں اور وہ اسلامی مفادات کے حصول اور مغرب و مغرب پرست قوتوں کے لادینی ایجنڈے کے رد کے لیے متحد و منظم ہوکر کام نہیں کرسکیں اور نہ ہی خود کو مذکورہ سیاسی مافیا کے مقابلے میں عوام کے لیے قابل قبول مترادف کے طور پر سامنے لانے میں کامیاب ہوسکی ہیں۔

۔ دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے والی تحریکیں اور تنظیمیں سادگی سے بعض بنیادی اسلامی باتیں عوام تک پہنچانے ہی کو آخری ہدف سمجھتی ہیں اور وہ دین کے اعلیٰ اور وسیع تر مفادات اور عملی زندگی پر ان کے انطباق سے عدم اعتناء کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ انہیں مغربی تہذیب کی ہلاکت اور اس کی اسلام دشمن پالیسیوں اور اقدامات کے ضرر کا احساس ہی نہیں اور نہ ہی وہ مغربی قوتوں اور ان کے مقامی مہروں کی لادین پالیسیوں سے مسلم عوام کو بچانے کے لیے کوئی لائحہ عمل رکھتی ہیں۔

ان حالات میں اسلام اور پاکستان سے محبت رکھنے والے اور اصلاح احوال کے خواہاں افراد کے لیے ہماری رائے میں یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ متحد اور منظم ہوکر تعلیم، میڈیا اور اصلاح اخلاق کے

لیے اوران کے ذریعے اس طرح کام کریں کہ مسلم عوام کی معاشی، معاشرتی، قانونی اورسماجی مشکلات و مسائل بھی حل ہوجائیں اوران کے دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی کا راستہ کھلے۔

اور یہ سارے کام ان آئینی و قانونی حدود کے اندر رہ کر کیے جائیں جن کی آئین پاکستان اجازت دیتا ہے۔ مندرجہ بالا شعبوں میں کیا کیا کام کیے جا سکتے ہیں اور کس طرح کیے جاسکتے ہیں اس کی تفصیلات بھی ہم سابقہ سطور میں دے چکے ہیں۔

## تلخیص بحث

اس بحث کوسمیٹتے ہوئے ہم عرض کرتے ہیں کہ:

۔ اس طرح کی تحریک سے احکام شریعت پرعمل ہوگا جو دنیا وآخرت میں کامیابی کے لیے ہر مسلمان کی ضرورت ہے۔ اور یہ پروگرام ایک لحاظ سے مسلم حکمرانوں کی طرف سے شریعت نافذ نہ کرنے کا متبادل بھی ہے کہ اگرتم نفاذ شریعت کی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو ہم خود جس حد تک شریعت کا نفاذ اپنے اوپر کرسکتے ہیں وہ کررہے ہیں۔

۔ اس سے ہماری دنیاوی مشکلات کم ہوں گی اور ہمارے مسائل حل ہوں گے۔ اوراس سے بڑھ کر بھلائی اورنیکی کیا ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کودکھوں اورتکلیفوں سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔

۔ اگرچہ یہ تحریک غیر سیاسی انداز سے کام کرے گی لیکن اس کا فائدہ بہرحال دینی سیاسی جماعتوں کو ہوگا اور ان کا ووٹ بنک بڑھے گا کیونکہ اس تحریک کے اپنے توکوئی سیاسی اہداف ہوں گےنہیں اور نہ یہ دینی سیاسی جماعتوں کی مخالفت کرے گی البتہ اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے عوام میں دینی شعور بڑھے گا اور اسلامی نظام زندگی کے لے ان کی تڑپ بڑھے گی اس لیے سیاسی لحاظ سے اس کا فائدہ دینی سیاسی جماعتوں کو ہی ہوگا۔

۔ ہم کوئی بہت انوکھی، نرالی اورتصوراتی قسم کی بات نہیں کہہ رہے جو قابل عمل نہ ہو۔ ہماری مجوزہ تحریک سے ملتا جلتا کام ترکی اور انڈونیشیا میں ہورہا ہے اور بہت مؤثر اورمفید ثابت ہوا ہے۔ تاہم ہر معاشرے اور ملک کےمخصوص حالات ہوتے ہیں لہٰذا کسی بیرونی تحریک یا تنظیم کی نہ تو پوری نقل کی جاسکتی ہے اور نہ کرنی چاہیے۔

ہم آخر میں البرہان کے قارئین اورخصوصاً اہل علم وفضل سے درخواست کریں گے کہ وہ ہماری اس تجویز کےحسن وقبح پرتبصرہ فرمائیں۔ ہم اس کےحق میں اوراس کے خلاف لکھی جانے والی دونوں

طرح کی شائستہ اور مدلل تحریروں کو البرہان میں شائع کریں گے، ان شاء اللہ۔

# امریکی غلامی سے اللہ کی پناہ

ہماری اشرافیہ کی اکثریت مغرب زدہ اور اعلیٰ اخلاقی اصول واقدار سے محروم ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اقتدار، ملازمت اور پیسے کی خاطر یہ لوگ ذہنی غلامی کے مرحلے سے گزر کر ملت اور وطن فروشی کی حد تک گر جائیں گے لیکن افسوس کہ ہماری بدقسمت آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور نہ زمین پھٹتی ہے اور نہ آسمان گرتا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہماری سیاسی اور عسکری قیادت نے امریکہ و یورپ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں ان کا حلیف بننا قبول کیا، مسلمان ہمسایہ ملک کو کچلنے میں ان کی مدد کی اور آج تک کر رہے ہیں۔ اپنی زمین، فضا اور سمندر ان کے حوالے کر دیے، انہیں اڈے، لاجسٹک اور انٹیلی جنس سپورٹ مہیا کی۔ ان کے کہنے پر قبائلی علاقوں پر حملے کیے، انہوں نے اسرائیل، روس، افغانستان اور بھارت کو ساتھ ملا کر پاکستان کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رکھی ہے، بلوچستان کو باقی ملک سے کاٹا اور توڑا جارہا ہے، ڈرون حملے ہورہے ہیں، اور اب دشمن نے ایبٹ آباد پر حملہ کرکے ان کی خوئے غلامی پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

کون کہتا ہے کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے؟ کیا آزاد اور خود مختار ملک ایسے ہوتے ہیں؟

پھر یاد رکھیے کہ ہمارا قصور بڑا ہے۔ امریکہ و یورپ نے عراق کو غلام بنا کے چھوڑ دیا، کویت کو غلام بنا کر چھوڑ دیا لیکن ہمیں وہ غلام بنا کر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے کہ ہم نے اس ملک کو اسلام کے نام پر بنایا اور اسے اسلام کا قلعہ بنانے کا اعلان کیا اور اگرچہ ہم اسے اسلام کا قلعہ نہیں بنا سکے لیکن ہمارے عوام اور دینی عناصر اس دعوے سے دست بردار ہونے کو آج بھی تیار نہیں اور پھر ہم ان کی مرضی کے خلاف ایٹمی قوت بھی بن گئے۔ یاد رکھیے ہمارے وجود کا ازلی دشمن بھارت بھی ان کے ساتھ ہے لہٰذا ہمارے دشمن ہمارا ایٹمی اسلحہ تباہ کر کے یا اس پر قبضہ کر کے بھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے بلکہ وہ ہمارا ملک توڑنا چاہتے ہیں، ہمارا نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے شر سے بچائے اور انہیں تباہ و برباد کرے)۔

اب بچنے کی ہمیں تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ جو لوگ اس صورت حال کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں (اور ماشاء اللہ وہ بہت ہیں) وہ متحد ہو کر متحرک ہو جائیں۔ اور عوام کو اپنے ساتھ ملائیں اور موجودہ سیاسی و عسکری قیادت سے جان چھڑائیں اور اُن کے بعد اور ان کے بغیر ملک چلانے کا انتظام کریں کیونکہ جب تک موجودہ سیاسی اور عسکری قیادت موجود رہے گی امریکی غلامی سے نہ نکلا جاسکے گا کیونکہ وہ یہ غلامی قبول کر چکے ہیں۔ کرنے کا کام اب صرف وہ ہے جو ہم نے عرض کیا ہے باقی قراردادیں، کمشن، وعدے،

نعرے یہ سب لیپاپوتی اور status guo بحال رکھنے کی براہ راست یا بالواسطہ کوششیں ہیں۔
اے اللہ! ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں امریکی غلامی سے اور امریکی غلاموں سے!

**تزکیۂ نفس** احمد جاوید

# خودنمائی و خود بینی ـــــ مضرات و علاج

## فرمان نبوی

۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے اور اللہ کی غیرت یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جو اللہ نے اس پر حرام کیا ہے۔(متفق علیہ)
[غیرت یہاں اس غضب کا نام ہے جو بے وفائی یا بغاوت پہ آئے۔ اللہ کی غیرت سرکشی، بغاوت اور بے وفائی پر جوش میں آتی ہے]۔

۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک مجلس میں لوگوں سے محو گفتگو تھے کہ ایک دیہاتی آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ گفتگو فرماتے رہے۔ لوگوں میں سے کسی نے کہا دیہاتی نے جو کچھ کہا ہے وہ آپ ﷺ نے سن تو لیا ہے لیکن اسے پسند نہیں فرمایا۔ کچھ نے کہا سنا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جب آپ ﷺ نے اپنی بات مکمل فرمائی تو فرمایا قیامت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے؟ پوچھنے والے نے عرض کیا میں حاضر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب امانت ضائع کی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پوچھا امانت کا ضائع کرنا کیسے ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا جب دین و دنیا کا معاملہ نااہل لوگوں کے سپرد کردیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔(صحیح بخاری)

۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو شہروں کے تمام حصوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ حصے ہیں جن میں مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ ناپسند حصے ان کے بازار ہیں۔(صحیح مسلم)

۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر تو طاقت رکھے تو سب سے پہلے بازار میں داخل ہونے والا اور سب سے آخر میں نکلنے والا ہرگز نہ بن اس لیے کہ یہ شیطان کا اڈہ ہے اور اس میں وہ اپنا جھنڈا نصب کرتا ہے۔

..............................................

آج ہم کوشش کریں گے کہ ایک ایسے مرض پر بات کریں اور اس کا علاج ڈھونڈیں جو دورِ جدید میں زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ جدید زندگی کی بناوٹ ایسی ہوگئی ہے کہ اس میں شامل رہنے کے لیے اس مرض میں مبتلا رہنا، لگتا ہے کہ ناگزیر ہوگیا ہے اور وہ مرض ہے خود بینی اور خود نمائی۔ اس مرض کا تعلق تکبر کے خاندان سے ہے۔ تکبر تمام گناہوں کی جڑ ہے اور یہ شرک ہے۔ اس تکبر کے بیج سے جو چیز بھی پیدا ہوگی اس میں شرک کا عنصر ضرور ہوگا۔ اس میں گناہ کی مشرکانہ صورت ضرور ہوگی۔ گناہ تو دیگر بھی بہت سے ہیں ممکن ہے ان گناہوں میں کہیں بے بسی شامل ہو، کہیں کمزوری داخل ہو۔ تکبر جیسی خطرناک بیماری کا لازمی عنصر ہوتا ہے دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور حقارت کی نظر سے دیکھنے میں صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ کوئی گھٹیا کام کر رہے ہیں اور آپ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ دوسرے چونکہ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ تحقیر کا رویہ اختیار کرنا فطری ہے۔ جس کو بھی اللہ کے فضل سے اپنا تزکیہ مطلوب ہے وہ یہ بات جان لے کہ حقارت سے دیکھنا چاہے سبب سے ہو چاہے بلاسبب ہو یہ تکبر کی نشانی ہے۔ یعنی آپ کے پاس کسی کی حقارت کا کوئی سبب بھی اگر ہو اور اس سبب کی آڑ لے کر آپ اس کی تحقیر کریں (جیسے اللہ کا نام لے کر اس کی تحقیر کریں) تو اس کا قوی امکان ہے کہ جس خرابی کی بنیاد پر آپ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اس سے کہیں بڑی خرابی میں آپ خود مبتلا ہیں۔

تکبر کا یہ لازمی عنصر یعنی دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا خود بینی اور خود نمائی میں پوری طرح کارفرما ہوتا ہے۔ خود بینی کہتے ہیں ہر صورت حال میں اپنی بڑائی اور اپنے مفاد کو ترجیح دینا یعنی خود ہی کو دیکھتے رہنا۔ زندگی گویا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے گزار دینا۔ اور یہ بھی کہ اگر کوئی ماحول اس کی بڑائی کو قبول نہ کرے تو وہ اس ماحول سے نکل جائے یا اس میں فساد برپا کر دے۔ دوسرا یہ کہ ہر صورت میں اپنے مفاد کو، اپنی راحت کو، اپنے فائدے کو مقدم رکھنا۔ یعنی جہاں ہم ۲۰ آدمی ہیں تو یہاں کسی ایک آدمی کو ایثار کرنا چاہیے کیونکہ کھانا ۱۹ آدمیوں کا ہے تو اگر ۲۰ آدمیوں کے مجمع میں ہر شخص یہ پیش کش اور اصرار نہیں کرے گا کہ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے تو وہ انسانی معاشرت کا کوئی فعال حصہ نہیں ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بنائے ہوئے نظامِ تعلق کا کوئی کارآمد پرزہ نہیں ہے۔ خود بینی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بنائی ہوئی معاشرت اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی گئی فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ نے ہمیں اپنی طرف یکسو رہنے کے لیے بھیجا ہے اپنی طرف منہ کر کے کھڑا رہنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ اگر کسی شخص میں خود بینی اور خود نمائی دونوں برائیاں اکٹھی ہوگئی ہیں کہ وہ ہر مجلس کا صدر بننا چاہتا ہے اور ہر فائدے کا لپک کر خود

طلب گار ہے اوراس میں ایسی شدت ہے کہ کسی کے نقصان کی قیمت پر بھی اپنا فائدہ حاصل کرنے کو مقدم رکھتا ہے۔کسی کی تکلیف کی اسے پرواہ نہیں ہے۔کسی کے نام پر سیاہی لگ جائے اسے کوئی پرواہ نہیں ہے۔اسے اپنے نام کو سب سے اونچی جگہ neon sign کی طرح چمکاتے رہنا ہے۔اگر یہ دونوں علامتیں کسی بے چارے میں جمع ہیں تو وہ یقیناً متکبر ہے۔اس کا کوئی بھی وصف قابل اعتبار نہیں ہے۔

اور پھر جس آدمی کو صرف اپنی بڑائی عزیز ہوگی وہ بڑائی کو ثابت کرنے والی صلاحیتیں بھی حاصل کرے گا۔وہ خوب قابلیت بھی پیدا کرے گا کہ اسے اپنا مفاد عزیز ہوگا۔وہ اس مفاد تک پہنچنے کے راستے ہم سب کے مقابلے میں زیادہ جانتا ہوگا۔اس میں ذہن بھی بہت ہوگا،صلاحیت (skill) بھی بہت ہوگی تو گویا یہ شخص بڑے بڑے اوصاف، بڑی بڑی فضیلتیں حاصل کرتا ہے۔یہ شخص تہجد کو دو گھنٹہ تک چلا دینے کی مشق رکھتا ہے۔یہ شخص ہر رکعت میں سو آیتیں پڑھنے کی پریکٹس رکھتا ہے۔اور یہ شخص دنیا کے اندر فائدہ پہنچانے کی جتنی openings ہیں ان سب کو اندر سے جھانکنے والی نظر اور قابلیت بھی رکھتا ہے۔ان تمام اچھی باتوں کو اس نے حاصل اس لیے کیا ہے کہ یہ وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو بڑا بنا دے تا کہ اس کی بڑائی کا دعویٰ claim دوسروں کے لیے سہولت سے قابل قبول ہوجائے۔اور یہ کہ یہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے مفادات تک زیادہ تیزی سے دوڑ کر انہیں حاصل کر سکے۔تو یہ چیز جدید آدمی کا مرض ہے۔جن لوگوں نے بھی جدید زندگی کو اختیار کر رکھا ہے۔چاہے نوکری کی سطح پر، چاہے پسند ناپسند کی سطح پر اور چاہے تعلیم کی سطح پر۔ان پر اللہ کا کوئی خاص کرم ہوتو شاید وہ اس خود بینی سے بچ گئے ہوں ورنہ جدید تعلیم سے لے کر جدید معاشرت تک سب میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ وہ آدمی کو خود بینی میں مبتلا کر کے رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جدید تعلیم کا خاصہ خود بینی کیوں ہے؟ جدید تعلیم مارکیٹ کی مسابقت (market competition) پہ کھڑی ہے۔انسانوں میں مسابقت ہوتی ہے۔یہ ماحول بھی فطری ہے اور یہ دوڑ بھی فطری ہے۔لیکن جدید تعلیم میں یہ مسابقت بنیوں جیسی ہے۔یہاں ہر علم اپنے آخر پر ایک پروانۂ ملازمت (appointment letter) کے حصول کا نام ہے جبکہ ہمارے روایتی نظام تعلیم میں سبقت لیتے تھے اخلاقی طور پر۔اب جدید زندگی دکھاوے پر کھڑی ہے۔جدید تعلیم شکاری کتوں کی دوڑ ہے۔جدید زندگی کی تمام اقدار دکھاوے کی ہیں۔جو آپ نہیں ہیں وہ pose کریں۔آپ امیر ہیں نہیں، امارت pose کریں۔آپ ذہین ہیں نہیں لیکن کانٹ اور افلاطون آ کر آپ سے

اپنا فلسفہ بیان کریں تو آپ بہت سر پرستانہ انداز میں سر ہلائیں کہ ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آپ با اخلاق ہیں نہیں لیکن اخلاق pose کر رہے ہیں کہ بہت نرم گفتار ہیں، بہت شریں کلام ہیں۔ اخلاق جتنا دنیا کا material بن سکتا ہے وہ اس جدید زندگی کا اسم اعظم ہے اسی لیے اس زندگی میں صلاحیت اور حمیت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اخلاق کہتے ہیں مضبوطی کے ساتھ نرم دلی کو۔ مطلوب اخلاق یہ ہے کہ مضبوط آدمی کا دل نرم ہونا چاہیے۔ حق کے ساتھ وفادار اور خلق کے ساتھ شفیق، یہ ہے اخلاق۔ اخلاق وہ انداز تعمیر ہے جس میں حسن بھی ہو اور مضبوطی بھی ہو۔ صاحب اخلاق وہ ہے جس سے حق کا دشمن خوف زدہ رہے اور کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے پائے کہ یہ بھی ہماری طرح ہے یا اس کا اور ہمارا کسی قیمت پہ اتفاق ہوسکتا ہے۔ اور اسی طرح اس کا دوست اس کی طرف سے بے فکر رہے۔ دشمنوں پر ہیبت اور دوستوں کی تسکین کا ذریعہ ہونا یہ آپ ﷺ کا برتا ہوا اخلاق ہے جس کو قرآن نے آئیڈیل کی شکل دی ہے۔ جدید زندگی نے مضبوطی کے تمام عناصر کو بازار کی قربان گاہ پہ پچھاڑ کر ان کا گلا کاٹ دیا ہے۔ جدید آدمی مضبوطی کے تمام غیر شخصی مقاصد کو بھول چکا ہے۔ اس کے لاشعور میں بھی یہ نہیں رہا کہ میرے لیے مضبوطی کی بنیاد حق ہے، میں خود نہیں ہوں یا یہ بازار نہیں ہے یا میرے یہ ادنیٰ اور گھٹیا مقاصد نہیں ہیں کہ میں ان کی طرف صاحب استقامت ہو کر دکھاؤں۔ تو یہ آدمی بازار کے ٹائم کا اتنا ہی پابند ہے جتنے صدیقِ اکبرؓ اپنے معمولات عبادت کے تھے۔ یعنی جدید کامیاب آدمی پابندیٔ وقت (punctuality) کی اعلیٰ ترین سطح پر ہے اور پابندیٔ وقت کی عین اسی سطح پر ہے جس سطح پر صحابہ، اولیاء اللہ اور آئمہ ہوتے تھے لیکن اس کی ساری (punctiality) کا محور دنیا ہے۔ اور دنیا کا مرکز خود اس کی ذات ہے۔ اس نے اللہ کی طرف سے بندگی کے لیے فراہم کی گئی تمام قوتوں کو دنیا پر نثار کر کے اس میں خود کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اس کے اندر اس طرح کے جذبات، احساسات اور تصورات رہ ہی نہیں گئے جو اس کی نفی کر سکیں۔ خود اس کی نظر میں جدید آدمی cross لگانے کے سو طریقے سیکھ کر آیا ہے، کچھ فلسفے سے اور کچھ سائنس سے۔ ''نہ'' کہنے کے ہزار طریقے یہ جانتا ہے اور نہیں جانتا تو اپنی نفی کا کوئی طریقہ نہیں جانتا۔ تو وہ آدمی انسان نہیں ہے محض ایک جاندار (biological being) ہے جو اپنی نفی کرنے کا مسلسل اظہار نہیں کرتا رہتا۔ خود بینی اس بنیادی انسانی ضرورت کے خلاف ہے کیونکہ جب آپ اپنی نظر میں رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو آپ اپنی نظر کا ہدف بنے رہنے کے لیے make up بہت سارے کرتے ہیں۔ جدید آدمی کی الماری میں دو

چار سو نقابیں ہوتی ہیں جو وہ روز پہن کر نکلتا ہے۔ یہ وہ بدنصیب مخلوق ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے لیے خالی کیا ہوا ہے۔ ایک خالی ہیولیٰ اور ایک وہمی وجود کو ''میں'' کہہ کر اس کی طرف متوجہ ہے۔ اس نے خود بینی (self abstraction) کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس چیز جبلی اور حیوانی سطح سے اوپر کی نہیں ہے۔ محض جبلت پر کاربند رہنے کے لیے خود کو اور دوسروں کو دینے کے لیے دھوکہ ہے کہ دیکھتے نہیں ہو میں نے NGO بھی بنا رکھی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں نے گلی کی نکڑ پہ ڈسپنسری بھی بنا رکھی ہے۔ تم دیکھتے نہیں ہو میرے پانچ مقالے فلاں رسالے میں چھپ چکے ہیں — تو یہ زندگی کے انسانی سطح کے اعمال کا جو بھی شبہ پیدا کرتا ہے ان کا اس کے حقیقی وجود کی تعمیر میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

## خود نمائی

خود بینی کی جڑواں بہن ہے خود نمائی۔ خود بینی خود پر خود کو impose کرنا ہے اور خود نمائی خود کو دوسروں پہ impose کرنا ہے۔ دنیا میں ایک آدمی ہمارے پاس ہمیشہ موجود ہے وہ ہمیں خدا ماننے کو بھی تیار ہے، نبی ماننے کو بھی تیار ہے، عظیم فاتح ماننے کو بھی تیار ہے، خلاصۂ وجود ماننے کو بھی تیار ہے۔ ہر آدمی کے پاس ایک ایسا آدمی ضرور ہے اور وہ، وہ خود ہے۔ اس مسخرے نے اپنی اس طرح کی فرضی شکل خود کو باور کرا رکھی ہے کہ یہ اس کا make up کر کے دوسروں سے اصرار کرتا ہے کہ تو بھی میرے self image پر ایمان لے آ۔ یہ اپنی جھوٹی self image کو دوسروں کے لیے binding بناتا ہے کہ میں خود کو کیونکہ آئن سٹائن سے بڑا سائنس دان سمجھتا ہوں لہٰذا دیکھتے نہیں ہو کہ میں نے سفید کوٹ بھی پہن رکھا ہے، اس کی طرح بال بھی اوپر کر رکھے ہیں اور مجھے حساب وغیرہ بھی آتا ہے لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم بھی اسی یقین سے اس حقیقت کو مانو جس سے میں خود کو مانتا ہوں۔ اور جتنی آپ مزاحمت کریں گے وہ اس کا نتیجہ یہ نکالے گا کہ آپ میں اس جیسی پہچان نہیں ہے کیونکہ آپ چھوٹے لوگوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ تو جو عظمت وہ رکھتا ہے اس کا کوئی تجربہ، مشاہدہ اور علم آپ کو حاصل ہی نہیں ہوا تو آپ اس لیے اس کو پہچاننے سے قاصر ہیں تو وہ آپ سے مسکرا مسکرا کے ملتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے ناراض نہ ہو، یہ ہے وہ تحقیر جس کا ہم ذکر کر رہے تھے۔ دنیا میں اجتماعی سطح پر انسانوں کے ساتھ ایسا تمسخر کبھی نہیں ہوا جیسا تمسخر جدیدیت نے آئینِ دنیا بنا کر دکھا دیا ہے۔ وہ تمسخر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو وہ دیکھو جو تم نہیں ہو اور دوسروں کو بھی وہی معدوم چہرہ دکھاؤ اور اسی پر اصرار کرو کہ میں یہ ہوں وہ نہیں ہوں۔

خود بینی اور خود نمائی ایک ہی آدمی کے دو امراض ہیں۔ اگر ہمیں ان سے بچنا ہے کہ جھوٹی آنکھ سے خود کو نہیں دیکھنا اور دوسروں سے بھی نہیں لڑنا کہ تم اپنی آنکھ نکال کر میری بنائی ہوئی وہ آنکھ اپنے سر میں لگالو جو غیر موجود کو موجود دیکھتی ہے اور موجود کا انکار کرتی ہے۔ پوری جدیدیت اسی اصول پر کھڑی ہے کہ موجود کا انکار کرو اور معدوم کا اثبات کرو۔

یہ ایک بہت بڑی روایت ہے کہ حاضر کو دکھاؤ اور غائب کو چھپاؤ لیکن ان مسخروں نے آئیڈیلز کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اگر اس ماحول میں جس میں ہر طرف ایک بیماری پھیلی ہو مثلاً الرجی ہی کو لے لیں اور ایک آدمی آکر کہتا ہے کہ مجھے تو کبھی چھینک بھی نہیں آئی تو ایسے آدمی پہ شک کرنے کا ہمیں حق حاصل ہے۔ آج کی دنیا میں کوئی شخص اگر خود نمائی اور خود بینی سے بچا ہوا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس پہ شک کا ہمیں حق حاصل ہے۔ مدرسے اور یونیورسٹی میں پڑھانے والے دونوں ایک ہی پھندے کے دو رنگ کے قیدی ہیں، وہ ہے جدیدیت کا پھندا۔ اور جس پر اپنی یہ بیماری واضح نہیں وہ الرجی زدہ علاقے میں ماسک پہن لے کہ کل چھینک آسکتی ہے۔

خود بینی اور خود نمائی کا لازمی عنصر ہے تنقید کو ناپسند کرنا خواہ ایسا شخص market manners کے طور پر لوگوں سے ہنس ہنس کر ملتا رہے۔ اس مزاج کی دو عمومی نشانیاں ہیں: ایک یہ کہ غصہ آئے دوسرا یہ کہ آپ کا اور میرا تعلق ویسا نہ رہے جیسا تنقید سے پہلے تھا۔ اور تیسری چیز شیطان کے خاص مصاحبین کو ودیعت ہوتی ہے کہ آپ نے مجھ پر سخت تنقید کر دی تو میں آپ کے پاس پہلے پندرہ دن میں ایک دفعہ آتا تھا اب ہفتے میں ایک دن آنے لگوں گا۔ آپ کے گلے میں ہاتھ ڈال ڈال کر تصویریں کھنچواؤں گا۔ آپ کے بچوں کو باور کراؤں گا کہ میں تمہارے باپ کا عاشق ہوں اور یہ سب کچھ عناد کے ساتھ ہوگا اور اس جذبے کے ساتھ ہوگا کہ میری کیا شان ہے کہ میں ایسے گھٹیا ناقدوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہوں۔

تنقید کا غلط اور درست ہونا بعد میں دیکھا جاتا ہے لیکن پہلا تاثر اگر ناگواری کا ہے تو یہ خود بینی ہے۔ اور میں چونکہ ٹوپی پہن کے باہر نکلتا ہوں تو اگر دوست ملنے آجائے اور ٹوپی نہ پہن رکھی ہو تو پہلے اس سے زیادہ فاصلہ طے کر کے ٹوپی پہنوں گا اور پھر اس سے ملوں گا تو یہ خود نمائی ہے۔

اسی طرح اگر میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن میں اس سوال کا جواب نہ دے سکنے کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو ٹالوں یا غلط سخن سازی کروں اور کبھی ایسا نہ کروں کہ آپ سے کہوں کہ بھائی یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا یا میری سمجھ میں تو آگیا ہے لیکن اس کا جواب میرے

ذہن سے اونچا ہے۔ اگر یہ ٹائپ ہے کہ آدمی مجیب گُل بنا ہوا ہے تو یہ خودنمائی ہے۔ آپ اگر کیمسٹری کا سوال مجھ سے پوچھنے آئیں گے تو مجھے ڈر جانا چاہیے کہ میرے اندر ایسی کیا خودنمائی ہے کہ آپ کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ میں کیمسٹری بھی جانتا ہوں۔ خودنمائی ہماری اصطلاح میں ''وبا'' ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے علاج یا حفاظت کا مسلسل اہتمام کرتے رہیں۔

اکتسابِ فضائل　　　احمد جاوید

# فکرِ آخرت

آخرت کا تصور نہ ہو تو دین اور اس کے تمام عقائد و احکام بے معنی ہیں۔ بندے اور اللہ کے تعلق کی تمام بنیادیں اور تمام نتائج اس پر موقوف ہیں۔ ویسے بھی ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ مسلمان کے لئے موت زندگی سے زیادہ اور آخرت دنیا سے زیادہ یقین اور حقیقی ہے۔ اس انتہائی ضروری عقیدے میں پختہ رہنے کے لئے اور اسے اپنی زندگی اور بندگی میں کمال پیدا کرنے والی قوت کے طور پر مستحضر رکھنے کے لئے ذہن، طبیعت اور عمل کا اس کی طرف یکسو رہنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے ئے چند فضائل کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو انشاء اللہ یہ عقیدہ ہمارے لئے ایک بہت بڑے اخلاقی محرک کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ حالت میں حاضر رہے گا اور ہماری شخصیت اپنے تمام اجزاء میں بندگی کے اصول پر مائل بہ ترقی حالت میں قائم رہے گی۔ وہ امور یہ ہیں:

۔ تعمیل احکام

۔ فکر آخرت

۔ موت سے وحشت نہ ہونا

۔ احساس ذمہ داری

## تعمیل احکام

تعمیل احکام یعنی عمل صالح آدھا دین ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی نجات کے لئے اس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ تعمیل احکام ہی ہے جو آخرت کو بندے کے لئے حسی طور پر یقینی بناتی ہے اور بندگی کی ماہیت یعنی مجاہدہ وطاعت سے ہمیں وابستہ رکھتی ہے۔

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہنا مناسب ہے کہ بندگی کے دو اجزاء ہیں۔ انہیں خوف اور امید کہہ لیں یا مجاہدہ اور طلب اجر کا نام دے لیں، بات ایک ہی ہے۔ دنیاوی زندگی میں مجاہدے کا غلبہ ہونا چاہئے اور آخرت میں عذاب سے بچنے یا اجر پانے کی امید ہونی چاہئے۔ محنت، مجاہدہ، سخت کوشش وغیرہ بندگی کے لوازم ہیں جن کے بغیر آدمی بندہ بننے کے تجربے سے نہیں گزر سکتا۔ احکام الٰہیہ کی بڑی مصلحت یہی ہے کہ ہمیں بندگی کا وہ تجربہ میسر آ جائے جس کی بنیاد پر ہم اپنا بندہ ہونا باور کر سکیں۔

احکام اور ان کی تعمیل کا اصول فطری مسلمات میں سے ہے یعنی اس کی جو بھی تشریح کی جائے یہ اس سے زیادہ واضح ہے لہٰذا اس کی تعریف اور توضیح درکار نہیں۔ ہاں! اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ حکم ہمیشہ محکم ہوتا ہے، اس کی مراد واضح ہوتی ہے، اسے سمجھنے کی بجائے اس پر عمل کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور تعمیل حکم کی اولیں شرط وہ ایثار ہے جس کی رو سے آدمی یہ کہنے اور سمجھنے میں سچا ہو سکتا ہے کہ میں اور میری خواہشات تصورات وغیرہ اللہ کے حکم اور مرضی کے آگے کوئی چیز نہیں۔ یہ سپرٹ نہ ہو تو تعمیل احکام کا داعیہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ قانونی زبان میں کہا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت میں کوئی شرط نہیں۔ جدید ذہنیت اور طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس اصول پر کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ تعمیل احکام کا عمل اپنے دوران میں عموماً ناخوشگوار یا سخت ہوتا ہے اس کی تکمیل البتہ راحت و اطمینان کی موجب ہوتی ہے۔ ابتدائی ناخوشگواری اور سختی کو اس ایثار کے بغیر نہیں جھیلا جا سکتا جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس لئے اپنی جہت اطاعت کو مضبوط بنانے کے لیے سب سے پہلے اپنی توجہ اس طرف رکھنی چاہئے کہ تعمیل احکام میری وہ سب سے بڑی ضرورت ہے جو تکلیف اٹھائے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ خیال اگر پختہ ہو جائے تو اس عمل میں اخلاص اور یکسوئی شامل ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی آخرت کا تصور جو تکلیف کو گوارا بناتا ہے، اوجھل نہیں ہوتا۔

گویا آخرت کے حوالے سے تعمیل احکام کے دو بڑے فائدے ہیں۔ آخرت کی بہتری اور آخرت کا استحضار۔ ہمیں بس یہی درکار ہیں۔ احکام پر پوری طرح چلنے کا بیان ہم ان شاء اللہ فضائل اعمال میں کریں گے یہاں جو کچھ رہ گیا ہے اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

### فکر آخرت

یہ سادہ سا اصول ہے جس پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں۔ آخرت کا تصور دو طرح سے ہوتا ہے: یوم الحساب اور روز جزاء۔ معاد کے عقیدے کو اپنے لئے بامعنی اور حقیقی بنانے کے لئے یوم الحساب کے تصور کو غالب رکھنا زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔ فکر آخرت اسی کا نام ہے۔

آدمی کے لئے یہ فطری بات ہے کہ وہ فائدہ حاصل کرنے کے مقابلے میں نقصان سے بچنے کی زیادہ خواہش رکھتا ہے۔ اسی کے پیش نظر آخرت کی فکر دنیاوی زندگی میں زیادہ اثرات کی حامل ہے۔ اس فکر کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی موت کو کثرت سے یاد کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ روز رات کو سونے سے پہلے دن بھر کے اعمال کا محاسبہ کرے۔ غلطیوں پر استغفار کرے اور نیکیوں پر اللہ کا شکر بجا لائے۔ پہلا طریقہ آخرت کو براہ راست پیش نظر رکھنے کے قابل بناتا ہے اور دوسرا طریقہ آخرت کو زیادہ دیر تک بھولنے نہیں دیتا۔ آخرت کی یاد، اس کے دونوں پہلوؤں یعنی یاد رکھنا اور فراموش نہ کرنا، ان دو طریقوں سے دسترس میں آ جاتی ہے اور اس طرح آخرت کی یاد طبعی کے ساتھ ساتھ شعوری اور ارادی بھی بن جاتی ہے۔

س: موت کو کثرت سے یاد کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

ج: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اور اس کی مراد واضح ہے۔ اس کا طریقہ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود متعین نہیں فرمایا لہٰذا ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ اس کی مراد کو سامنے رکھیں اور طریقہ خود وضع کر لیں۔ اس رویے میں حکمت یہ ہے کہ موت کی یاد کو محض حافظے تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں طبیعت کو متاثر کرنے کی قوت بھی ہونی چاہیے۔ طبیعت یکسانی سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تنوع چاہیے۔ موت کی یاد بھی طبیعت کو اسی وقت متاثر کرے گی جب اس میں تنوع ہو۔ اس کا قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ گھر سے نکلتے وقت، رات کو سوتے وقت، نماز پڑھتے ہوئے اور دعاء کے دوران میں اپنی موت کے خیال کو حاضر رکھا جائے اس طرح موت کی مطلوبہ یاد اپنے پیکر خود تراش لیتی ہے۔

باقی یہ کہ موت کی یاد کا بڑا مقصود گناہ اور نافرمانی سے بچنا ہے۔ انسانی طبائع میں گناہ گاری کے مختلف اسالیب پائے جاتے ہیں مثلاً لذت پسندی، کاہلی، سرکشی، بے حیائی وغیرہ۔ آدمی کی طبیعت کا

میلان ان میں سے جس خرابی کی طرف زیادہ ہو اس کا خیال اور ارادہ کرتے وقت موت کو تکلف سے یاد کر لینا چاہیے۔ ایسا کرنا فوری طور پر بھی موثر ہو گا اور مستقل تاثیرات کا دروازہ بھی اسی سے کھلے گا۔ گویا موت کی یاد گناہ کی کوشش اور عزم کے وقت فیصلہ کن تاثیر رکھتی ہے بشرطیکہ بندہ ایسا کر لے۔

**موت سے وحشت نہ ہونا**

س: موت سے وحشت نہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ج: موت سے وحشت یا کراہت نہ ہونا دو پہلوؤں کا حامل ہے۔ ایک پہلو نفسیاتی ہے اور دوسرا دینی یا ایمانی۔ نفسیاتی پہلو سے موت سے وحشت یا ڈر بڑی حد تک ایک طبعی چیز ہے۔ ایک آدمی جو نفسیاتی طور پر نارمل بھی ہو اس کی طبیعت مرنے کی طرف رغبت نہیں رکھتی ۔ یہ بے رغبتی اگر محض طبیعت تک محدود رہے تو ایمانی اعتبار سے بعض شرائط کے ساتھ طبیعت کا نقص تو کہلائے گی لیکن اس کا اثر بنیادی دینی تقاضے پر نہیں پڑتا۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جس طبیعت میں موت کی طرف سے وحشت اور بے رغبتگی نہ ہو وہ دینی اعتبار سے ایک کامل بندے کی طبیعت ہے لیکن یہ حکم لگانا کہ ایسی حالت شریعت کے مقتضٰی کے خلاف ہے اور کوئی دینی خرابی ہے، ٹھیک نہیں۔ انسانی طبیعت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس میں زندگی اور راحت کی طرف ایک قوی میلان پایا جاتا ہے۔ موت، جیسا کہ ظاہر ہے، اس میلان سے متصادم ہے لہٰذا طبیعت میں موت کا ڈر ٹھیٹھ انسانی صورت حال میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے غیر فطری یا غیر اخلاقی یا غیر دینی کہا جائے البتہ اس ڈر کو انسانیت کی سب سے بڑی اساس یعنی تصور آخرت پر غالب نہیں آنا چاہئے۔ یہ اصول دینی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے محکم ہے۔ دینی موقف تو واضح ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے بھی ایک نارمل انسان کی طبیعت یعنی بنیادی میلانات کو اس کے شعور اور فہم یعنی


البرہان فورم

اٹک میں ڈاکٹر انعام اللہ صاحب نے البرہان فورم قائم کیا ہے جس میں البرہان کے مضامین کا اجتماعی مطالعہ کیا جاتا ہے اور مضامین پر بحث کی جاتی ہے۔

عقائد ونظریات پر غالب نہیں آنا چاہیے۔ اسی پہلو سے ہم نے اوپر کہا تھا کہ موت سے وحشت کو دینی شخصیت کا نقص کہا جا سکتا ہے لیکن خرابی یہ اس وقت ہوگی جب اس کی وجہ سے آخرت نا مطلوب اور غیر مرغوب ہو جائے۔ دینی پہلو سے موت سے وحشت اور کراہت اس کے طبعی وقوع کا انکار یا تردید نہیں ہے۔ یہ جب آخرت کے تصور کو نا قابل قبول، ناپسندیدہ اور نظر انداز کئے جانے کے قابل بنا دیتی ہے تب ایک دینی موقف قائم ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں موت سے وحشت نفس کی امارگی ہے اور طبیعت کے فساد کا یقینی مظہر ہے جو بندگی کے بنیادی مقاصد کو مجروح کرتا ہے (جاری ہے)۔

مفتی عبدالقدوس ترمذی ☆

# دینی مدارس میں تدریس فقہ واصول فقہ

یہ حقیقت تو سب پر واضح ہے کہ دین کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اجماع امت بھی بڑی اہمیت اور عظمت کا حامل ہے اور جو قیاس مستنبط من ھذہ الأصول الثلاثہ ہے اس کا بھی اپنا ایک درجہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ایک عظیم نظام ہے کہ اس نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اقدس میں حضرات صحابہ کرامؓ کی جماعت کو پیدا فرمایا، جنہوں نے براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دین کو حاصل کیا۔ آپؐ کے بارے میں قرآن مجید نے وضاحت فرمائی ہے ''ویعلمھم الکتاب والحکمة'' کہ آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں بنیادی مقصد کتاب وسنت کی تعلیم ہے، تو صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے قرآن وسنت کی تعلیم بھی حاصل کی اور آپؐ

☆ مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال، سرگودھا (جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ، اقبال ٹاؤن لاہور میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی نشست سے خطاب)۔

نے ان کا تزکیہ بھی فرمایا اور پھر اس عظیم جماعت سے دین کی حفاظت کا کام لیا گیا۔ صحابہ کرامؓ کی اس عظیم جماعت میں چند ہستیاں ایسی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی دولت سے نوازا اور انہیں بطور خاص فقہ میں بڑی عظیم مہارت عطا فرمائی۔ انہوں نے قرآن وسنت کو سمجھا اور ان میں خوب غور وخوض فرمایا اور بعض واقعات سے واضح ہے کہ جہاں ضرورت پیش آئی انہوں نے قرآن و سنت کو سامنے رکھ کر اجتہاد بھی فرمایا۔ چنانچہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم وہاں کیا طریقہ اختیار کرو گے؟ کس طرح فیصلے کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے واضح طور پر عرض کیا کہ میں قرآن پاک کو دیکھوں گا، پھر سنت کو اور اس کے بعد فرمایا ''اجتهد برأيی'' اسی طرح اور بھی بعض مجتہدین اور فقہاء صحابہ کرامؓ ہیں جن کا علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں ذکر کیا ہے۔

یہ ''اعلام الموقعین'' ہے یا ''موقّعین'' ہے یہ بھی ایک قابل تحقیق مسئلہ ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے مقدمہ ''اعلاء السنن'' کی تعلیقات میں اس لفظ کی خاص تحقیق فرمائی ہے اور بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اہل علم اس کی طرف مراجعت کریں اور اس کے لیے اعلاء السنن کا مقدمہ دیکھیں۔

بہرحال علامہ ابن قیم نے ''**اعلام الموقعین**'' میں ان صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور میں قرآن وسنت کے ماہر، فقہ کے امام اور فتاویٰ کے لیے مرجع تھے۔ فقہ وفتاویٰ کا علم بہت زیادہ وسیع ہے اس لیے کہ قرآن وسنت میں قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوں، اب ظاہر ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام واقعات اور حوادث کا بیان قرآن پاک میں واضح طور پر تو نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک ''تبیان لکل شیء'' ہے، یعنی اس میں ہر چیز کا بیان اجمال کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کے اصول اس میں آ گئے ہیں۔ بعض چیزوں کے اصول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں اور احادیث طیبہ میں آئے ہیں جبکہ بعض چیزوں کی تفصیل بھی موجود ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ قیامت تک کے ہر واقعہ کا حکم اس میں آ جائے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں یہ سلسلہ شروع ہوا کہ انہوں نے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو سامنے رکھتے ہوئے نئے وقائع، حوادث اور حالات کا استنباط فرمایا۔ اصل میں فقہ بڑا وسیع، عمیق اور

بہترین علم ہے اور ''تفقہ'' اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جس کو بھی وہ عطا فرمادیں، کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''من یرد اللہ خیرا یفقهه فی الدین''۔ حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے، بخاری شریف کی روایت ہے کہ جریر نامی ایک بڑے عابد عبادت کررہے تھے۔ اس دوران ان کی والدہ نے ان کو پکارا، انہوں نے جواب نہ دیا، چنانچہ ان کی والدہ نے ان کو بددعا دے دی جس پر ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا کہ ایک بچے کے بارے میں ان پر تہمت لگادی گئی ،لیکن جب وہ بچہ ان کے پاس لایا گیا تو انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا والد کون ہے؟ ان کی کرامت تھی کہ بچے نے بول کر بتادیا کہ اس کا والد کون ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ لوگ پہلے ان سے انتہائی متنفر ہوئے کیونکہ لوگ اصل بات کی تحقیق نہیں کرتے ،فرمان باری تعالیٰ ''ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا'' پر تو عمل ہے ہی نہیں، چنانچہ جب ان پر تہمت لگی تو لوگ ان پر برہم اور برافروختہ ہوئے حتیٰ کہ جس جگہ وہ عبادت کررہے تھے اس کو بھی انہوں نے گرادیا۔ اب جب کرامت دیکھی تو کہنے لگے کہ ہم آپ کی عبادت گاہ کو سونے کا بنا دیتے ہیں، حضرت جریر نے فرمایا کہ بس اس کو ویسا ہی بنادو جیسی کہ پہلے تھی، بہرحال جب حضورؐ کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''لو کان فقیهاً لأجاب امه'' کہ جریر فقیہ ہوتے تو اپنی ماں کو جواب دیتے۔ یہ تفصیل اپنی جگہ ہے کہ نفل نماز کا کیا حکم ہے اور فرض کا کیا ہے؟ کب جواب دینا چاہیے اور کب نہیں، اس بات کا تعلق بھی فقہ سے ہے۔

بہرحال فقہ ایسا عظیم الشان علم ہے کہ اگر انسان کے سامنے فقہ کے اصول ہوں تو قیامت تک پیش آنے والے واقعات اور حالات کے احکام کے بارے میں اس کو کوئی پریشانی پیش نہیں آسکتی، لیکن یاد رکھیے! ہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ فقیہہ بن جائے اور یہ دعویٰ کرنے لگے کہ میں فقیہہ ہوں اور مجتہد ہوگیا ہوں۔ آج کل یہ بھی مسئلہ ہے کہ اذا صلی الحائک رکعتین وانتظر الوحی، اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں کہ اب یہ عجیب مسئلہ چل پڑا ہے۔

بہرحال فقہ کا یہ عظیم علم صحابہ کرام کے دور میں شروع ہوا پھر تابعین، تبع تابعین میں بہت سے فقہاء کرام پیدا ہوئے، حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ تابعین میں سے ہیں، ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں آپ کی وفات ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی پیدائش ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اس پر ایک لطیفہ بھی ہے کہ بعض احناف نے شوافع سے کہا کہ جب تک ہمارے امام زندہ رہے آپ کے

امام نہیں آ سکے تو وہ کہنے لگے کہ جب ہمارے امام آ گئے تو آپ کے امام چلے گئے۔

میں نے عرض کیا کہ امام ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے قرآن وسنت اور فقہ کی بہت خدمت کی اور بے شمار مسائل کا استنباط کیا۔ آپ کے علاوہ بھی بہت سے حضرات فقہاء امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام اوزاعی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ بہت سے آئمہ نے فقہ کی تدوین کے لیے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں، **جزاھم اللہ احسن الجزاء**۔

لیکن حضرت امام صاحب کے ہاں فقہ وفتاویٰ اور استنباط مسائل کے حوالے سے جو کام ہوا ہے وہ نہایت عظیم الشان اور بے مثال ہے۔ فقہ حنفی وہ واحد فقہ ہے جس میں یہ نظام ہے کہ بہت سے علماء کو جمع کر کے ان کے سامنے مسائل رکھے گئے، پھر ان کے بارے میں مشاورتیں ہوئیں، اجلاس ہوئے۔ ہمارے آج کل کے اجلاس تو عام طور پر نشستن، گفتن و برخاستن سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہوتے لیکن ان مجالس میں لاکھوں مسائل کا استنباط کیا گیا، علماء کی اس کمیٹی کے اندر بارہ لاکھ سے زائد مسائل کا استنباط ہوا۔ یہ کمیٹی کا لفظ آپ کے سمجھانے کے لیے عرض کر دیا، اس لفظ کے بغیر شاید آپ بات کو سمجھ نہ سکیں، یہ ہماری آج کل کی مجبوری ہے۔ حضرت مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ہمارے پاس سوال کرنے کے لیے آتے ہیں تو اردو سے زیادہ انگلش کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، فرماتے تھے کہ میں تو ان کی بات سمجھتا ہی نہیں کہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ جب اردو میں بات ہو رہی ہے تو اردو بولیں، اور اگر آپ انگلش میں بات کرنا چاہ رہے ہیں تو ٹھیک ہے انگلش میں بات کریں، لیکن جب آپ اردو میں بات کر رہے ہیں، اور میں بھی اردو میں بات کر رہا ہوں تو پھر کم از کم اردو تو بولیں اس میں بھی آپ نے انگلش اور دوسری زبانوں کے الفاظ ٹھونس دیے، یہ کیا بات ہوئی؟

بہرحال فقہاء کی اس لجنہ میں (جس کو آج کل کمیٹی کہہ دیا جاتا ہے) کیسے کیسے حضرات شامل تھے؟ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر جیسے حضرات جن میں ایک ایک اپنے وقت کا عظیم فقیہہ ہے، بلکہ حضرات فقہاء نے یہ تصریح کی ہے کہ حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد بھی مجتہد تھے۔ مجتہد سے میری مراد مقید (مجتہد فی المذہب) نہیں بلکہ ان حضرات کو مجتہد مطلق شمار کیا گیا ہے۔ لیکن ان حضرات نے اپنے استاذ محترم کی عظمت کی وجہ سے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کیا، اس لیے یہ

حضرات مجتہد منتسب کہلاتے ہیں۔ مجتہد منتسب اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم اور اپنے مقام کے اعتبار سے مجتہد (مطلق) ہو لیکن کسی دوسرے مجتہد کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرلے۔

پھر امام محمدؒ نے امام صاحب کے مذہب کو اس انداز سے مدون اور مرتب کیا کہ ان کو محرر مذہب ابو حنیفہ کہا جانے لگا۔ حضرت امام محمد نے نو سو ننانوے کتابیں تصنیف فرمائیں **کما فی مقدمة الدر المختار للعلامة علاء الدین الحصکفیؒ**، جن میں مشہور چھ کتابیں ہیں جو کہ فقہ حنفی میں ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ماشاء اللہ یہ کتابیں شائع بھی ہوگئی ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے امام محمد کی کتاب ''**السیر الکبیر**'' یا غالباً ''**المبسوط**'' کے بارے میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ اس کتاب کا نسخہ اونٹ پر لاد کر خلیفہ کے دربار میں لایا جارہا تھا، راستے میں کوئی عیسائی ملا، اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ امام محمد کی کتاب کا مسودہ ہے جو انہوں نے تصنیف کی ہے، اس کو خلیفہ کے دربار میں پیش کررہے ہیں تاکہ ان کو پتہ چلے کہ یہ ان کے دور کے اتنے بڑے عالم ہیں۔ ہمارے یہاں کے وزراء اور صدور کے سامنے کوئی کتاب پیش کی جائے مثلاً ''اعلاء السنن'' یا کوئی اور کتاب ان کے پاس لے کے چلے جائیں تو شاید نام کا تلفظ بھی بار بار دھرانا پڑے گا کیونکہ وفاق المدارس کے آخری درجے کی سند الشہادۃ العالمیہ جب سینٹ میں پیش کی گئی تو اس وقت کے وزیر تعلیم اس کو الشہادۃ الأ لمیہ پڑھ رہے تھے، اور یہ تلفظ بھی انہوں نے کئی تکلفات اور بڑی محنت کے بعد گویا آخری درجے میں ادا کیا، اس سے پہلے وہ کوئی اور لفظ کہتے رہے۔ نوائے وقت کے ''سرراہے'' نے اس پر بہت اچھا لکھا کہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان کے وزیر تعلیم کو عربی کا ایک لفظ بھی صحیح پڑھنا نہیں آتا۔

تو جب المبسوط کا وہ مسودہ خلیفۂ وقت کے پاس لے جایا جارہا تھا، اس عیسائی نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ امام محمد کی کتاب ہے، تو اس نے جواب میں کہا **هذا محمد كم الأصغر** یہ تو تمہارے چھوٹے محمد کا حال ہے **فكيف محمد كم الأكبر** تو تمہارے بڑے محمد کا کیا حال ہوگا؟ اس پر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا۔

انہی امام محمد کا قول یاد آیا، فرماتے ہیں: **ان صناعتنا هذه من المهد الى اللحد** کہ اس علم کا معاملہ ختم نہیں ہوا یہ مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ خود امام ابو یوسف کا جب انتقال ہورہا تھا اس وقت ایک

مسئلہ پر بحث ہوگئی کہ حج میں رمی راکباً ہوگی یا راجلاً ؟ افضل طریقہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو ہوئی آخری گفتگو کرکے وہ صاحب باہر نکلے ابھی دہلیز پر نہیں پہنچے تھے کہ امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بہرحال میرے بزرگو اور دوستو! امام محمد کا یہ ارشاد: **''ان صناعتنا ھذہ من المھد الی اللحد''** کہ یہ ختم ہونے والا مسئلہ نہیں، یہ تو آخری وقت تک چلتا ہے۔

تو دیکھ لیجیے! ان حضرات نے کتنے لاکھ مسائل کا استنباط فرمایا، اور فقہ تو ایک بہت گہرا علم ہے کسی بھی ایک علم پر اگر انسان صحیح طور پر محنت کرلیتا ہے تو وہ علم بھی اس کو تمام علوم کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہوجاتا ہے۔ خود امام محمدؒ نے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت امام کسائی کو، جو قاری بھی ہیں اور بہت بڑے نحوی بھی ہیں، جب دیکھا کہ ان کا زیادہ تر نحو میں اشتغال ہے — بعض اوقات آدمی کسی چیز میں محو ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہوا تو ملاح سے پوچھا کہ آپ کو نحو بھی آتی ہے؟ ملاح نے جواب دیا کہ مجھے تو نحو نہیں آتی، تو کہنے لگے کہ آپ کی آدھی زندگی تباہ ہوگئی اس پر ملاح کو بڑا افسوس ہوا اور رنج ہوا کہ اس شخص نے بہت بڑا اعتراض کردیا کہ تیری آدھی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ایسا ہوا کہ کشتی بھنور میں پھنسنے لگی تو ملاح نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ کو تیرنا بھی آتا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا نہیں مجھے تیرنا نہیں آتا، تو اس ملاح نے کہا کہ آپ کی تمام زندگی تباہ ہوگئی، اب آپ بالکل فارغ ہیں۔

تو جب امام محمدؒ نے دیکھا کہ امام کسائی کا نحو میں اشتغال زیادہ ہے تو فرمانے لگے، **لم لا تشغل بالفقه؟** یعنی فقہ میں آپ کیوں مشغول نہیں ہوتے؟ فقہ پر کام کرو، اس کو پڑھو اس کو پڑھاؤ۔ امام کسائی نے جواب میں فرمایا **من احکم علما فذلک یھدیه الی سائر العلوم** کہ آدمی ایک علم میں مضبوط ہوجائے تو وہ ایک علم ہی اس کو تمام علوم کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کا بہت بڑا دعویٰ تھا۔ وہ بھی امام محمد تھے، فرمانے لگے میں آپ کا امتحان لیتا ہوں، ایک شخص پر نماز میں سجدۂ سہو واجب ہوگیا، اس کے بعد وہ شخص نماز میں پھر بھول گیا، تو اس شخص کے ذمے نماز کے آخر میں ایک سجدہ ہوگا یا کئی سجدے ہوں گے؟ اس پر امام کسائی فرمانے لگے کہ بھائی ایک سجدہ

---

☆ یعنی مکمل دسترس رکھنا

ہوگا۔ امام محمد نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ تم نے نحو کے کون سے قاعدے اور ضابطے سے یہ جواب دیا ہے؟ تو امام کسائی نے بلاتامل یہ فرمایا کہ **المصغر لا یصغر** ایک دفعہ جب کسی اسم کی تصغیر ہوجائے تو دوبارہ نہیں ہوتی۔ یہ قاعدہ تو ہم نے بھی پڑھا ہے لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے۔ صاحب البحر علامہ ابن نجیمؒ نے یہ واقعہ البحر الرائق میں بیان فرمایا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی نے اپنا قیام دیوبند کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ راستے میں میری حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے ملاقات ہوگئی، حضرت نے بلالیا۔ حضرت تھانوی کا داخلہ دارالعلوم دیوبند میں ۱۲۹۵ھ میں ہوا ہے۔ اور حضرت نانوتویؒ کی وفات ۱۲۹۷ھ میں ہے تو یہ حضرت نانوتویؒ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہوگا۔ بہرحال حضرت نانوتویؒ نے آپ کو بلالیا، فرمایا کیا پڑھتے ہیں آپ؟ حضرت فرماتے ہیں میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں ہدایہ پڑھتا ہوں — یہ فقہ کی مشہور کتاب ہے، میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ آپ نے منطق میں کیا پڑھا؟ فرمانے لگے کہ مختصر المعانی۔ بڑا مختصر جواب دیا لیکن معانی نہیں تھے، یا پھر اس کے کچھ اور ہی معانی ہوں گے۔

بہرحال حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں ہدایہ پڑھ رہا ہوں، اس پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ مولوی صاحب! ایک ہے ہدایہ کا پڑھنا اور ایک ہے ہدایہ کا گھُننا ☆، پڑھنے اور گھُننے میں فرق ہے۔ اس پر حضرت قاسم نانوتویؒ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک جگہ دعوت تھی اور دعوت میں بڑے علماء کو مدعو کیا گیا تھا۔ دعوت کا قبول کرنا تو آپ جانتے ہیں کہ سنت ہے اس کا ترک کسی حال میں نہیں ہوسکتا۔ اس دعوت میں اہل علم جمع تھے، کسی صاحب نے کوئی سوال کیا اور مسئلہ پوچھا۔ ایک عالم نے اس کا جواب دیا، وہ صاحب کہنے لگے کہ جی اس کا حوالہ کہاں ہے؟ وہ عالم فرمانے لگے کہ ہدایہ میں ہے، وہاں پر ایک عالم موجود تھے، جو بہت بڑے عالم تھے اور تھے نابینا، ظاہر ہے کہ ان کو ساری کتابیں زبانی ازبر ہونی چاہئیں، اس لیے ان کو ہدایہ زبانی یاد تھی، وہ فرمانے لگے کہ یہ ہدایہ میں نہیں ہے، اب بینا اور نابینا میں تعارض ہوگیا۔ وہ عالم فرمانے لگے کہ ہدایہ لے آؤ میں دکھا دیتا ہوں۔ ہدایہ لائی گئی تو اس عالم نے ہدایہ کی ایک عبارت پڑھی اور اس کی ایک قید سے بتا دیا کہ مسئلہ یوں ہے تو وہ نابینا عالم رونے لگے اور فرمایا کہ اصل میں ہدایہ تو انہوں نے پڑھی ہماری تو ساری زندگی ضائع ہوگئی۔ اس کو کہتے ہیں گننا، نہ یہ کہ سرسری طور پر تو ساری کتاب سے گزر جائے لیکن سمجھ کر نہ پڑھا جائے۔ ہمارے طلباء کا زیادہ تر عمل اسی پر ہے کہ **ان فی العبور لبرکۃ** کہ عبور میں بھی برکت

ہے عبور اور مرور ہی ہوجائے، بھائی یہ کوئی میدان عرفات تو نہیں ہے کہ مرور ہو گیا تو حج ہو گیا، بہرحال صرف پڑھنا تو مقصود نہیں۔

ہمارے حضرت مفتی جمیل احمد تھانویؒ صاحب ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے اور بارہا انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ حکومت برطانیہ نے ایک مرتبہ منصوبہ بنایا کہ تمام مسلم اوقاف کو حکومت کی تحویل اور کنٹرول میں لیا جائے۔ اس کے خلاف تحریک چلی، حکومت نے بھی کچھ مسودات جاری کیے، جن کا جواب فقہی اعتبار سے تیار کرنا تھا۔ اس کے لیے حضرت تھانویؒ نے علماء کا ایک اجتماع کیا اور ان کی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کو کمیٹی کہہ لیں یا لجنہ، جو بھی کہیں بہرحال مقصد تو ایک ہی ہے، جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

اوری بسعدی والرباب وانما انت الذی تعنی وانت المؤکل

عبار اتنا شتی وحسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

حضرت نے مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ اور میرے جد امجد حضرت مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ کے ذمے لگایا کہ آپ فقہی عبارات دیکھیں اور جمع کریں، پھر حکومت کے اس مسودے کا جواب لکھا جائے گا۔ حضرت مفتی جمیل احمد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے ذمہ البحر الرائق لگائی گئی جو علامہ ابن نجیم کی مشہور کتاب ہے۔ حضرت امام کسائی کا واقعہ میں نے اسی کتاب کے حوالہ سے بتایا ہے۔ تو البحر الرائق حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی صاحبؒ کے ذمہ تھی، باقی کتابیں دوسرے حضرات دیکھ رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں سے دیکھ کر کچھ عبارتیں لکھیں پھر کسی کام سے باہر گیا، واپس آیا تو البحر الرائق کے جو صفحات میں دیکھ چکا تھا انہی صفحات میں سے مزید کچھ عبارتیں حضرت مفتی عبدالکریم صاحب تحریر فرما چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ بہت سی عبارتیں انہی صفحات کی لکھی ہوئی تھی جن کو میں دیکھ چکا تھا، اس پر حضرت مفتی صاحب احقر کے جد امجد سے کہنے لگے کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، میں یہ کام نہیں کرتا، میں نے ان صفحات میں سے جتنی عبارتیں لکھیں، میرا اپنے طور پر خیال تھا کہ ہمارے مقصد کی بس یہی عبارتیں ہیں، لیکن ان عبارتوں کو دیکھ کر اب یہ معلوم ہوا کہ بہت سے عبارتیں ایسی تھیں جو

ہمارے مقصد کی تھیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آئیں، اس لیے میں اس کام کا اہل نہیں ہوں، میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر حضرت داداجان نے فرمایا کہ مولوی صاحب ایسا نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت مظاہرالعلوم میں پڑھاتے تھے اور شیخ الادب تھے۔ داداجان فرمانے لگے کہ آپ اس شعبہ کے آدمی بھی نہیں ہیں اس کے باوجود آپ نے جتنی عبارتیں نقل کی ہیں وہ سب کی سب مفید مطلب ہیں، ایسا بھی تو ہوسکتا تھا کہ غیر مفید عبارتیں نقل کردیتے جیسا کہ آج کل عام طور پر نقل میں ایسا ہی ہوتا ہے، آپ کی سب کی سب عبارتیں مدعیٰ پر دال ہیں، اور آپ نے صحیح انتخاب کیا ہے، اس لیے آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے یہ کام تو ظاہر ہے کہ عرصہ دراز تک کرنے کے بعد انسان کی سمجھ میں آتا ہے۔

اس پر حضرت داداجان فرمانے لگے کہ آپ پریشان نہ ہوں مجھے یہاں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں فتاویٰ کا کام کرتے ہوئے ۱۵ سال ہوگئے ہیں، اور جب سوالات آتے ہیں تو ہم ان کے جوابات کے لیے فقہی کتابوں میں عبارتیں تلاش کرتے ہیں لیکن جواب نہیں ملتا۔ بالآخر ہم حضرت تھانوی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ حضرت اس مسئلے کا کوئی جزئیہ نہیں مل رہا، تو حضرت کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ لائیو ''ہدایہ'' ۔عرض کرتے ہیں کہ حضرت ''ہدایہ'' تو ہم نے دیکھ لی ہے۔فرماتے ہیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں لے آؤ ''ہدایہ'' ۔ ہدایہ لے کر آئے تو حضرت ہدایہ کی عبارت کی کسی قید سے یہ بتا دیتے کہ اس قید سے یہ مسئلہ نکل رہا ہے، تم کہہ رہے ہو کہ ہدایہ میں نہیں ہے، پھر ہماری سمجھ میں بھی آیا کہ یہ تو ہدایہ کے اندر لکھا ہوا ہے۔

حضرت (احقر کے والد) صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک دور تھا کہ ہدایہ پڑھانے والے کے گھر پر جھنڈا لگتا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ یہ بڑا عالم ہے جو ہدایہ کو پڑھا سکتا ہے، اور اس کو حل کرسکتا


## مغربی تہذیب پر لیکچر سیریز

صفاء انسٹی ٹیوٹ میں جمعرات ۱۲ مئی ۲۰۱۱ء کو احمد جاوید صاحب کا لیکچر ہوا جس میں اہل علم نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اگلا لیکچر ان شاء اللہ ۱۴ جون ۲۰۱۱ء کو ہوگا۔

ہے، میرے خیال میں اب تو سب مکانات پر جھنڈے ہونے چاہئیں۔ میں نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ ہدایہ کا اصل نام کیا ہے؟ یہ کونسی کتاب سے ماخوذ ہے تو بیچارہ کبھی کچھ بتاتا کبھی کچھ، بہرحال جب سے علامہ عبدالحیٔ لکھنوی نے ہدایہ پر حاشیہ لکھا ہے اس وقت سے تقریباً ہم سب مرورتو کرا ہی رہے ہیں۔

آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ شیخ الاسلام برھان الدین المرغینانیؒ صاحب ہدایہ بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے ۱۳ سال کی مدت میں یہ کتاب لکھی ہے، اصل میں یہ کتاب ''**كفاية المنتهى**'' کا اختصار ہے جو قاہرہ کے کتب خانہ میں ۸۰ جلدوں میں موجود ہے پھر اس کا خلاصہ صاحب ہدایہ نے ۱۳ سال کی مدت میں لکھا پھر فرمایا کہ تمہاری مرضی ہے وہ پڑھ لو یا یہ پڑھ لو، **وللناس فيما يعشقون مذاهب**۔ ہماری حکومتوں کا علم کی قدردانی کا یہ حال ہے کہ **كفاية المنتهى** کا پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ میں نے تو آپ کو بتادیا کہ وہ قاہرہ کے کتب خانہ میں موجود ہے کوشش کیجیے جدوجہد سے مل جائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔تو ہدایہ بڑی زبردست اور عظیم کتاب ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ جیسے امام ابوحنیفہؒ کی فقہ عظیم الشان ہے جس کی تدوین کے لیے علماء کے اجلاس بلائے گئے، مشورے کیے گئے، پھر مسائل کا استنباط ہوا، ایسا ہی معاملہ ہدایہ کا ہے کہ فقہ حنفی میں جتنی کتابیں ہیں ان سب میں ہدایہ سب سے عظیم کتاب ہے اور یہ صرف فقہ حنفی کی خصوصیت ہے۔ دیگر فقہا کے ہاں بھی فقہ کی جو کتابیں ہیں ان میں ہدایہ جیسی کوئی کتاب نہیں (جاری ہے)۔

ڈاکٹر محمد امین

# دینی مدارس اور عصری تعلیم

دینی مدارس کے سامنے آج کل ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو عصری تعلیم دیں یا نہیں؟ اس سوال کا دوٹوک جواب دینے کے لیے کئی پہلوؤں پر غور ضروری ہے:

## خارجی دباؤ

بظاہر یہ مسئلہ خارجی دباؤ کا نتیجہ لگتا ہے۔ مغربی حکومتیں پاکستان کی حکومت پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ دینی مدارس میں اصلاحات کی جائیں اور نتیجتاً پاکستانی حکومت یہ دباؤ مدارس پر منتقل کر دیتی ہے۔ اب دینی مدارس چلانے والے علماء کرام چونکہ حکومت کا اس طرح کا کوئی دباؤ قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں کہ وہ دینی مضامین میں یا ان کے نصاب میں کوئی تبدیلی قبول کریں۔ اس لیے لے دے کر حکومت کے پاس یہی ایجنڈا رہ جاتا ہے کہ مدارس پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے ہاں عصری مضامین پڑھائیں۔ بظاہر اس کے پیچھے یہ خواہش کارفرما محسوس ہوتی ہے کہ اس طرح دینی مدارس عام تعلیم کے دھارے کے قریب آجائیں گے، ان کے طلبہ میں مزعومہ 'انتہاپسندی' کم ہوجائے گی اور اگر اس کے نتیجے میں کچھ طلبہ عصری تعلیم حاصل کر کے مارکیٹ میں ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں تو اس سے بھی دینی مدارس کے، جو معاشرے سے کٹے ہوئے ہیں، 'منفی اثرات' میں کمی واقع ہوگی۔ اسے وہ دینی مدارس کی Modernization and Mainstreaming کہتے ہیں۔

## دینی مدارس کے مقاصد تعلیم

دینی مدارس کے عصری تعلیم دینے یا نہ دینے کے حوالے سے جو بنیادی اور اصولی بات ہمارے دینی مدارس کے غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ اپنے مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟

ہمارے موجودہ دینی مدارس جو اصلاً ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد بننے والے ان مدارس ہی کا تسلسل ہیں جو اُس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس محدود مقصد کے لیے بنائے گئے تھے کہ مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی مساجد آباد رہیں اور معاشرے میں اسلامی روایت کے مطابق نکاح، طلاق اور خوشی و غم کی رسمیں جاری رکھی جاسکیں تاکہ ہندوستان پر انگریز کے غلبے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے وجود اور بقاء کو جو خطرات لاحق ہوگئے تھے، ان کا سد باب کیا جاسکے۔

ظاہر ہے قیام پاکستان کے بعد اس صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی آگئی لیکن نئے حکمرانوں کی اسلامی آئین، اسلامی طرز حیات اور اسلامی تعلیم سے عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مدارس اسی پرانے ڈھرے پر چلتے رہے اور اپنے اسلاف کے قائم کردہ اس موحد نظام تعلیم کی طرف نہ لوٹ سکے جو مسلم معاشرے اور ریاست کے سارے شعبوں کے لیے افراد کار تیار کرتا تھا نہ کہ صرف مساجد و مدارس کے لیے۔ جو تعلیمی ثنویت انگریزی عہد میں تاریخی جبر کے طور پر ہندی مسلمانوں کو قبول کرنا پڑی تھی کہ مذہبی تعلیم کے لیے دیوبند اور دنیاوی تعلیم کے لیے علی گڑھ الگ الگ ہوں گے، قیام پاکستان کے بعد اسے جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس کے دو انتہائی خطرناک نتیجے نکلے، ایک یہ کہ ریاست اور معاشرے کا نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جن کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم یا تعلیم کا دینی تناظر ایک مؤثر عامل کے طور پر موجود ہی نہ تھا اور نہ اس میں علماء کے لیے عملاً کوئی کردار تھا۔ دوسرا یہ کہ دینی مدارس جو افراد پیدا کررہے تھے وہ سوائے مدارس اور مساجد میں کام کرنے کے اور کوئی مصرف نہ رکھتے تھے یوں وہ عملاً معاشرے اور ریاست سے کٹ کر رہ گئے۔

## موجودہ عصری تعلیم کی خرابیاں

اس کا حل یہ نہیں ہے کہ دینی مدارس وہ عصری تعلیم دینا شروع کردیں جو پاکستانی اور سکولوں کالجوں میں دی جاتی ہے کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے درج ذیل بڑے نقصانات ہوں گے:

i۔ پاکستان میں عصری تعلیم کا سارا نظام مغربی تہذیب کے ملحدانہ افکار (سیکولرزم، ہیومنزم، کیپٹل ازم، لبرلزم۔۔۔وغیرہ) اور اقدار و تربیت پر مبنی ہے جس کے ذرے ذرے میں الحاد و بے دینی ایسے ہی موجود ہے جیسے جسم میں خون گردش کرتا ہے اور جس طرح خون انسانی جسم کی صحیح پرداخت پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح جدید نظام تعلیم کا نصاب، طریقِ تربیتِ اساتذہ، ہم نصابی سرگرمیاں، درس گاہ کا ماحول۔۔۔۔غرض اس کی ہر چیز مغربی فکر و تہذیب کو ابھارتی ہے اور اسلامی ذہن و فکر کو تاراج کرتی ہے جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ مسلم شخصیت میں فکری انتشار، عدم یکسوئی اور بے کرداری ہے۔اور اگر دینی مدارس اس نظام تعلیم اور اس کے نصاب، نصابی کتب اور اساتذہ کو اپنائیں گے تو اس کا زہر لازماً دینی مدارس کے طلباء پر بھی اثر انداز ہوگا اور ان کے طلبہ کی شخصیت، فکر اور کردار کو

لازماً مسموم کرے گا۔

ii۔ دونوں طرح کے نصابات کو جمع کرنے سے طلبہ پر بوجھ لازماً بڑھے گا جس سے دینی تعلیم کا معیار بھی متاثر ہوگا۔ ممکن ہے کچھ ذہین اور محنتی طلبہ اس بوجھ کو محسوس نہ کریں لیکن اس کے دوررس اثرات طلبہ کی اکثریت پر بحیثیت مجموعی لازماً منفی ہوں گے اور دینی تعلیم میں بتدریج سطحیت آئے گی اور رسوخ فی العلم کم ہوگا جو پہلے ہی کئی اسباب کی بناء پر روبہ زوال ہے۔

iii۔ جدید تعلیم اور اس میں اچھے نتائج چونکہ اچھی ملازمت ملنے میں مدد ہوں گے لہٰذا دینی تعلیم کی وقعت اور اہمیت بتدریج کم ہوتی چلی جائے گی اور عصری تعلیم کی اہمیت دن بدن شعوری و لاشعوری طور پر بڑھتی چلے جائے گی۔

لہٰذا ہم اس بات کو غیر مفید سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس اپنے ہاں موجودہ عصری تعلیم کا انتظام کریں اور دونوں کو علی حالہ قائم رکھتے ہوئے جمع کریں۔ چونکہ یہ معاملہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے اور کچھ بڑے دینی مدارس نے ہی اس پر عمل شروع کیا ہے اس لیے اس کے بُرے نتائج ابھی واضح ہوکر سامنے نہیں آئے لیکن ہم شعبۂ تعلیم میں اپنے طویل تجربے کی بناء پر پورے یقین سے کہتے ہیں کہ دینی مدارس کو اپنے نظام تعلیم میں موجودہ عصری تعلیم کو جمع کرنے سے نقصان ہوگا۔ فھل من مدکر؟

## حل کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر دینی مدارس کے لیے اپنے نظام میں موجودہ عصری تعلیم کو جمع کرنا نقصان دہ ہے تو اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ دیکھیے! اگر حکومت پاکستان تعاون کرے اور نظام تعلیم سے ثنویت ختم کرنا چاہے اور اسے اسلامی امنگوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہے اور موجودہ اندھی مغرب پرستی کی روش ترک کرنا چاہے تو معاملات سہل ہوسکتے ہیں اور وہ یوں کہ ابتدائی دس بارہ سال کی تعلیم سب مسلمان طلبہ کے لیے مشترک ہو اور یہ ایسی ہو جس سے اسلامی اور عصری دونوں طرح کی ضرورتیں پوری ہونے کی مستحکم بنیاد مہیا ہوجائے اور اس کے بعد علوم وفنون میں تخصص کا مرحلہ ہو جس

---

☆ اگرچہ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر علماء کرام صحیح معنوں میں متحد ہوکر جدوجہد کریں اور حکومت پر دباؤ ڈالیں تو حکومت ان کے مطالبے ماننے پر مجبور ہوجائے گی لیکن اسکے لیے بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے خواہ اس کے لیے ایجی ٹیشن کرنا اور جیل جانا پڑے —— اور ظاہر ہے نظام تعلیم کو اسلامی بنانے کے لیے ایسی جدوجہد علماء کرام نے آج تک کی نہیں۔

میں موجودہ دینی مدارس علوم اسلامیہ میں درجہ تخصص کی ڈگری دیں اور سوشل و نیچرل سائنسز کے باقی شعبوں کا نظام و نصاب بھی اسلامی اقدار و مقاصد کے مطابق ہو۔ اس سے نظامِ تعلیم میں وحدت بھی پیدا ہو جائے گی اور ہمارا تعلیمی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

لیکن حکومت پاکستان نے پچھلے ۶۳ سال میں یہ کام نہیں کیا اور اِس وقت ملک کے سیاسی حالات جہاں تک پہنچ چکے ہیں اُن میں اپنے حکمرانوں سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس معاملے میں کوئی پیش رفت کریں گے☆ گویا اب نظامِ تعلیم کی مکمل اصلاح و بہتری کی ذمہ داری علماء کرام کے سر آن پڑی ہے کہ تعلیم کا وہ حصہ جو ان کے پاس ہے وہ اسے بھی بہتر بنائیں اور جو عصری تعلیم معاشرے میں مروج ہے اس کی بھی اصلاح کریں۔

یہ کام کیسے ہو سکتا ہے اور اس کے کم از کم تقاضے کیا ہیں؟ ہم اس بارے میں اپنی طالب علمانہ گزارشات دینی مدارس کے علماء کرام کے غور و فکر کے لیے ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

## ابتدائی تقاضا

اس کا سب سے پہلا اور ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ سارے وفاقوں کے علماء کرام مل بیٹھ کر سوچیں اور دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے مقاصد پر نظر ثانی کرتے ہوئے یہ اقرار و اعلان کریں کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ایک ہونا چاہیے اور اس میں دین و دنیا کی ثنویت نہیں ہونی چاہیے اور یہ کہ اس نظامِ تعلیم کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو اچھے اور باعمل مسلمان ہوں، دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزار سکیں اور مسلم معاشرے اور ریاست کو اسلامی مقاصد اور عصری ضرورتوں کے مطابق چلانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں اور اس طرح اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکیں۔

اس اقرار و اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ علماء کرام نہ صرف مذہبی تعلیم کے اُس حصے کا از سرِ نو جائزہ لیں اور اسے بہتر و مؤثر بنائیں جو اِس وقت اُن کے زیر انتظام ہے بلکہ تعلیم کے اُس عصری حصے کی اصلاح اور اسے اسلامی امنگوں اور تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور چلانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کریں جو اِس وقت دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے مغربی تہذیب کے تناظر میں چلا رہے ہیں۔ ان دونوں حوالوں سے علماء کرام کی حکمت عملی اور لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم علماء کرام کے غور و فکر کے لیے اس کا ایک خاکہ ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں (جاری ہے)۔

ڈاکٹر محمد امین

# بچوں کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کا کردار (۲)

## چند اعتراضات اور ان کے جوابات

بچے کی اسلامی تربیت میں سکول انتظامیہ کے کردار کے حوالے سے ہم نے جو کچھ کہا ہے اگرچہ وہ بالکل واضح ہے لیکن جس ماحول اور معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں، ہمیں احساس ہے کہ ہمارے اس مؤقف پر سکول چلانے والوں کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوں گے اور اگرچہ ہم سکولوں کے لیے مینوئل/ ہینڈ بک لکھنے بیٹھے ہیں کوئی نظریاتی کتاب نہیں لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم نے اپنے قارئین کو مطمئن نہ کیا اور ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے اطمینان بخش جوابات نہ دیے تو وہ ہمارے اس تربیتی مینوئل پر عمل نہیں کر پائیں گے اس لیے طوالت کے خطرے کے باوجود ہم یہاں سکول انتظامیہ کے افراد کے ذہنوں میں اٹھنے والے ممکنہ سوالات کے جوابات دینا چاہیں گے۔

**سوال:** آپ نے سطور بالا میں تعلیم کو روزگار اور بزنس بنانے کی مذمت کی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ سکول بند کر کے کوئی اور کام شروع کر دیں؟

**جواب:** ہمارا ہرگز یہ مقصد نہ تھا بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ لوگوں نے تعلیم کو روزگار اور کاروبار بنالیا ہے لیکن وہ اس کے اسلامی تقاضے پورے نہیں کر رہے اور جو تعلیم وہ دے رہے ہیں وہ ناقص اور غیر اسلامی ہے۔

دیکھیے جناب! مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے تعلیم کبھی مسلم معاشرے میں تجارت اور انڈسٹری نہیں رہی بلکہ ہمیشہ خدمت (service) اور خدمت خلق رہی ہے اور مسلم معاشرہ اس کی اہمیت کے بارے میں اتنا حساس رہا ہے کہ یہ کام اس نے ریاست وحکومت پر بھی نہیں چھوڑا بلکہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چنانچہ تعلیم مسلم تاریخ میں اکثر و بیشتر پرائیویٹ سیکٹر میں رہی ہے اور ہمیشہ خدمت اسلام اور خدمت خلق کے جذبے سے لوگ اس کے لیے زندگیاں وقف کرتے اور وسائل مہیا کرتے رہے ہیں۔ حکمران، وزراء، امراء اور عام کھاتے پیتے لوگ اس کام کے لیے پیسے، زرعی زمینیں اور عمارتیں وقف کر دیتے تھے اور یوں تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے ہوتے رہتے تھے، اساتذہ کی مالی کفالت ہوتی رہتی تھی اور اساتذہ بھی اس کام کو خدمت، مشن بلکہ دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے تھے نہ کہ اسے محض روزگار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ پس جس آدمی میں ذوق اور صلاحیت ہوتی تھی اور وہ کارِ تعلیم میں لگ جاتا تھا تو معاشرہ اس کی کفالت اپنے ذمے لے

لیتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں دینی مدارس آج بھی اسی اصول پر کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی انگریزوں کے آنے سے پہلے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اوقاف (وقف یعنی ٹرسٹ) پر مبنی تھا جس سے لوگوں کی دینی ضروریات بھی پوری ہو رہی تھیں اور معاشرے اور ریاست کو رجال کار بھی مہیا ہو رہے تھے۔

عالمی سطح پر تعلیم کو کاروبار بنانا مغرب کی ملحدانہ فکر اور اس کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کا ثمر ہے جس کے پیش نظر صرف دنیا اور دنیا کی خوشحالی ہے اور ان کے ہاں بزنس سے مقصود صرف نفع اندوزی بلکہ ہر قیمت پر زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی ہے جس میں دین اور اخلاق کا کوئی کردار نہیں اور چونکہ مغربی تہذیب اس وقت دنیا کی غالب تہذیب ہے جس نے مسلمانوں کو صدیوں تک محکوم رکھا ہے اور مسلم معاشرہ اس وقت جس ذہنی غلامی، معاشی زبوں حالی اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے وہ براہ راست نتیجہ ہے اہل مغرب کی حاکمیت، سازشوں اور مسلم دشمنی کا۔ لہٰذا مغربی تہذیب کے تتبع میں مسلم ممالک اور پاکستان میں بھی تعلیم پرائیویٹ سیکٹر میں بڑی حد تک کاروبار بن چکی ہے۔

تعلیم کو کاروبار بنانا کئی لحاظ سے غیر اسلامی ہے۔ بنیادی بات نیت کی ہے جس کا صحیح ہونا اسلام میں بہت ضروری ہے۔ ایک صحابی مکان تعمیر کرا رہے تھے اور انہوں نے کمرے میں روشن دان رکھوایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے روشن دان کیوں رکھوایا ہے؟ تو اس صحابی نے جواب دیا کہ روشنی اور ہوا کے لیے۔ تو آپ ؐ نے فرمایا اگر تم یہ کہتے کہ روشن دان اس لیے رکھوایا ہے کہ تم اذان کی آواز سن سکتے اور نماز باجماعت کے لیے بروقت مسجد میں پہنچ سکتے تو روشنی اور ہوا تو پھر بھی آتی رہتی۔ اسی طرح ایک آدمی کسب رزق کے لیے بہت بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کے پاس سے گزرا تو کسی صحابی نے تبصرہ کیا کہ کاش یہ اتنی محنت دینی کاموں کے لیے کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس آدمی کی نیت اپنے اہل وعیال کو رزق حلال مہیا کرنے کی ہے تو یہ عین دینی کام ہی تو کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان طبیب/ ڈاکٹر اگر نیت یہ کرے کہ اس نے اللہ کی خوشنودی کے لیے مخلوق خدا کی خدمت کرنی ہے اور ان کے دکھ درد دور کرنے ہیں تو لوگ پھر بھی اس کو دوا کی قیمت اور اس کی مہارت کا معاوضہ تو دیں گے ہی (یا وہ لے سکتا ہے) لیکن اس کے مقابلے میں اگر اس نے طب/ میڈیسن پڑھی اور سیکھی ہی اس نیت سے ہو کہ اس نے اس پیشے سے کروڑوں کمانے ہیں اور لوگوں کو لوٹنا ہے تو ظاہر ہے یہ نیت پہلی کی مقابلے میں بہت کمتر اور بُری ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان اگر پیشۂ تدریس کو اپناتا ہے یا تعلیمی کاموں پر اپنا مال صرف کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے طلبہ کو اچھا مسلمان بنائے گا، ان کو دین اور دنیا کی تعلیم دے گا تاکہ وہ اپنے مالک وخالق کی رضا کے مطابق زندگی گزار سکیں تو اس نیت کی وجہ سے اس کا کام عین عبادت اور عین دینی کام بن جائے گا خواہ طلبہ اور ان کے والدین اس کی محنت و کوشش کی بناء پر اس کی خوب مالی خدمت کریں اور وہ آسودہ حال ہوجائے۔ لہٰذا نیت کا درست رکھنا ضروری ہے اور اگر نیت درست ہو اور پیش نظر اللہ کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی خدمت ہو تو سارے دنیوی کام عبادت اور نیکی بن جائیں گے۔ پھر اس نیت کے اچھے اثرات بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر کوئی مریض یا طالب علم ڈاکٹر اور استاد کی مالی خدمت اس لیے نہیں کرسکتا کہ وہ مفلس و نادار ہے تو استاد یا ڈاکٹر اس کو پھر بھی تعلیم اور دوا دے گا تاکہ یہ اللہ کے نزدیک اس کی نیکی شمار ہو اور اسے ثواب ملے۔ اس طرح معاشرے میں محبت اور بھائی چارہ بڑھے گا اور یہ رویہ پیدا نہیں ہوگا کہ جو سکول یا ڈاکٹر کی فیس نہیں دے سکتا وہ اسے تعلیم اور علاج ہی سے محروم کردے۔

تعلیم کو کاروبار سمجھنے کی ذہنیت کا نقصان یہ ہوا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی اور لالچ و حرص نے ان مسلمان علم بیچنے والوں اور تعلیم کو کاروبار سمجھنے والوں کو مغربی تجارتی اخلاق سے بھی محروم کردیا ہے (اسلامی اخلاق تو غیر متعلق ہو ہی چکے) کیونکہ مغرب کے تجارتی اخلاق کا بھی تقاضا یہ ہے کہ اگر قیمت اچھی وصول کرنی ہے تو مال بھی اچھی کوالٹی کا دیا جائے اور گاہک کی ضرورت اور مرضی کا بھی خیال رکھا جائے۔ لیکن ہمارے تعلیم کو کاروبار بنانے والوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ قیمت (یعنی فیس) پوری وصول کرتے ہیں لیکن مال (تعلیم) کوالٹی کا نہیں دیتے۔ تعلیم کی اعلیٰ کوالٹی کا تقاضا یہ ہے کہ:

۱۔ استاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں لیکن ہمارے یہ علم بیچنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد نہیں رکھتے کیونکہ انہیں تنخواہ زیادہ دینا پڑتی ہے اس لیے یہ کم پڑھے لکھے استاد رکھتے ہیں تاکہ انہیں تنخواہ کم دینا پڑے۔ اس غرض سے یہ تربیت یافتہ اساتذہ بھی نہیں رکھتے کیونکہ انہیں بھی زیادہ تنخواہ دینا پڑتی ہے۔ اور یہ خود بھی ان کی ٹریننگ کا انتظام کرسکتے ہیں لیکن نہیں کرتے کیونکہ اس کے لیے پیسے خرچ کرنے پڑیں گے اور محنت بھی کرنی پڑے گی جبکہ یہ ان دونوں کاموں کے لیے تیار نہیں ہوتے کیونکہ وہ Quality Conscious ہی نہیں ہوتے اور ان کی نیت اعلیٰ کوالٹی کی تعلیم دینے کی ہوتی ہی نہیں۔

۲۔ یہ موزوں نصاب اور نصابی کتب کی تیاری اور فراہمی پر بھی محنت نہیں کرتے۔

۳۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ طلبہ سے زیادہ سے زیادہ فیسیں لیں اور انہیں کم سے کم سہولتیں دیں تا کہ بچت زیادہ سے زیادہ ہو۔

۴۔ ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی یہ کم سے کم خرچ کرتے ہیں اور حیلے بہانے والدین سے زیادہ سے زیادہ فنڈز لینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ تعلیم کو اگر تجارت سمجھا جائے تو مال (تعلیم) کا گاہک کی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہونا بھی ایک اہم اخلاقی تقاضا ہے لیکن ہمارے تعلیم بیچنے والے اس کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اپنے بچوں کو ان کے تعلیمی اداروں میں بھیجنے والوں کی اکثریت مسلمان ہوتی ہے اور ایک مسلمان کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ خود وہ خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اپنے بچوں کے لیے اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اچھے مسلمان بنیں۔ لہٰذا ہر مسلمان چاہتا ہے کہ اس کی اولاد لائق ہو، محنتی ہو، اس کے اخلاق اچھے ہوں، کردار اچھا ہو۔ سب مسلم والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ جھوٹ نہ بولے، چوری نہ کرے، گالی نہ دے، لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ لیکن ہمارے ہاں تعلیم کے سوداگر اس بات کا ذرا لحاظ نہیں کرتے اور بچوں کی ذرا بھی تربیت نہیں کرتے۔

۶۔ پھر ہر معاشرے کو یہ مطلوب ہوتا ہے کہ اس کے تعلیمی ادارے ایسا فرد پروان چڑھائیں جو اس معاشرے کے نظریات ومعتقدات کے مطابق ہو، جس کے اخلاق و عادات اور رویے معاشرے سے ہم آہنگ ہوں تا کہ وہ اچھا شہری اور معاشرے کا کارآمد اور مفید کارکن بن سکے لیکن ہمارے سوداگر انِ تعلیم معاشرے کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان بھی نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمان معاشرے کے لیے کالے انگریز پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر بامرمجبوری ہم نے تعلیم کو کاروبار بنا ہی لیا ہے تو بھی ہمارے تعلیمی سوداگروں کو اتنا تو ضرور کرنا چاہیے کہ وہ اعلیٰ کوالٹی کی تعلیم دیں اور ایسی تعلیم دیں جس میں دنیاوی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ مؤثر دینی تعلیم بھی ہو۔ بچوں کی اس طرح تربیت کریں جس طرح والدین اور معاشرہ چاہتا ہے

---

☆ ایک فرضی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے گانے سے اس کے آشیانے میں لکڑیوں کو آگ لگ جاتی ہے جس میں یہ خود جل کر مرجاتا ہے۔ پھر جب کبھی بارش برستی ہے تو اس کی راکھ سے انڈا پیدا ہوتا ہے اور اس انڈے سے دوسرا ققنس پیدا ہوتا ہے۔

یعنی ان کی تعمیر سیرت و کردار اسلامی اصولوں پر کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ یہ مغرب کے طے کردہ تجارتی اصولوں (Business Ethics) کے بھی خلاف ہے۔

سوال: آپ کا اس بات پر اصرار کہ اسکول اسلامی ہو اور مغربی تہذیب کو رد کرے محض ایک نعرہ اور تھیوری (Theoretical Assumption) ہے جس کا عملی زندگی کے حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سکول انگلش میڈیم نہ ہو اور آکسفورڈ کی کتابیں نہ لگوائیں تو والدین اپنے بچے کو ایسے سکول میں داخل ہی نہیں کراتے اور نہ اچھی فیس دینے پر تیار ہوتے ہیں۔ شلوار قمیض والے اردو میڈیم سکول کو اب کون پوچھتا ہے؟

جواب: ہمیں آپ کی رائے میں کچھ مبالغہ محسوس ہوتا ہے۔ معاملے کے صحیح فہم کی خاطر یہاں دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے: ایک اصولی اور آئیڈیل مؤقف اور دوسرے عملی اصلاح کی خاطر صحیح نیت کے ساتھ لیکن کراہت و مجبوری کے تحت کچھ Compromises کر لینا۔

اصولی اور آئیڈیل مؤقف یہ ہے کہ:

۱۔ ہمارا موجودہ نظام تعلیم دور غلامی کی یادگار اور اس کا تسلسل ہے۔ یہ غلام ذہن کے مغرب زدہ ملازمین پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اور یہ وہی کام آج بھی خشوع وخضوع سے کر رہا ہے۔

۲۔ اس میں درخ اندوزی (patch work) یعنی معمولی کمی بیشی سے کوئی بڑی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ یہ مکمل اوور ہالنگ مانگتا ہے۔ اگر ہم غلامانہ ذہنیت سے اوپر اٹھ کر سوچ سکیں تو یہ دریا برد کرنے کے قابل ہے یا اس کی راکھ سے قفنس☆ کی طرح ایک نئے نظام کی ولادت درکار ہے۔ جس کے مقاصد اپنے ہوں، اسلامی تقاضوں کے مطابق نیا نصاب ہو، تربیت اساتذہ کا نیا منہج ہو اور جس میں سکولوں کے ماحول کو بدلنے کے لیے ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں کو نیا آہنگ دیا جائے۔

۳۔ تعلیم کی ویسٹرنائزیشن کو علی الاعلان پوری شعوری قوت کے ساتھ رد کر دیا جائے کیونکہ:

---

☆ یہ بات ہم نے اپنی کئی کتابوں میں تفصیل سے کہی ہے دیکھئے مثلاً 'مسلم نشأۃ ثانیہ — اساس اور لائحہ عمل'، 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' اور 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'۔

(i) مغربی فکر وتہذیب ملحدانہ اور کافرانہ فکر وتہذیب ہے اور یہ بات ہم غلامی کے ردعمل اور مغرب کے خلاف تعصب یا نفرت کی وجہ سے نہیں کہہ رہے بلکہ دلائل کی بنیاد پر، مغربی فکر وتہذیب کے مطالعے کے بعد عقلی و منطقی بنیادوں پر کہہ رہے ہیں کہ مغرب کی بنیادی فکر اور اس کا ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ) خلاف اسلام ہے ☆

مغرب کے ورلڈ ویو کی بنیاد ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم پر ہے۔ ہیومنزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا خدا خود ہے، کسی 'الٰہ' کا 'عبد' نہیں ہے۔ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا کو ماننا ہی ہے تو اپنی نجی زندگی میں مان لے لیکن اجتماعی زندگی یعنی معاشرے (سول سوسائٹی) اور ریاست کے امور میں بہرحال خدا کی خدائی کا اتباع نہیں کیا جاسکتا۔ کیپٹل ازم کے مفاہیم کا نچوڑ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے انسان کی ساری تگ و دو اور اس کی کوششوں کا محور یہی دنیا کی بہتری اور مادی ترقی و فوائد ہونے چاہئیں اور آخرت کے تصور کو اس کے آڑے نہیں آنا چاہیے۔ ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ 'حق' کی بنیاد ہماری حِسّوں (senses) سے موصول ہونے والا معلوماتی مواد ہے جس کا ہم اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے تجربہ اور مشاہدہ کرسکتے ہیں لہٰذا انسانی زندگی پر وحی اور خدائی ہدایت (یعنی مذہب) کا غلبہ اور حاکمیت (sovereignty) قبول نہیں کی جاسکتی۔

یہ ہے وہ فکر اور ورلڈ ویو جس پر مغرب کی تہذیب کھڑی ہے۔ اب ہر شخص یہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے کہ مغرب کی یہ فکر اور ورلڈ ویو اسلام کی فکر اور ورلڈ ویو کے بالکل متضاد ہے۔ کیونکہ اسلام نام ہی اس چیز کا ہے کہ اللہ ایک ہے، وہ سب سے بڑا ہے۔ خالق، مالک، رب، نفع ونقصان اور زندگی وموت پر قادر ہے اور انسان محض اللہ کا عبد اور بندہ ہے جس کا کام اللہ کی عبادت اور غیر مشروط و لامحدود اطاعت ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے اور اس کی زندگی کی آخری غایت اللہ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ آخرت کی زندگی کو دنیا پر ترجیح حاصل ہے اور انسان کی ہدایت کا انحصار اللہ تعالیٰ کی رہنمائی یعنی وحی (قرآن وسنت) پر ہے۔ لہٰذا مغرب کی فکر اور ورلڈ ویو خلاف اسلام ہے اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہے۔ خلاصہ یہ کہ مغرب کے علوم اور اس کی تعلیم، اس کا نصاب، اس کا منہج تربیت اساتذہ اور اس کی ساری نصابی، ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں جو اس خلاف

اسلام ورلڈ ویو پر مبنی ہیں، مسلمانوں کے لیے نا قابل قبول ہیں۔

(ii) دنیا کی کسی قوم اور ملک نے آج تک اپنی تہذیب چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب، اس کے علوم، اس کی تعلیم، اس کی زبان، اس کے رہن سہن (لائف اسٹائل) اور اس کے لباس کی نقالی کر کے ترقی نہیں کی۔ ہمارے سامنے جاپان اور چین نے ترقی کی لیکن دونوں کا اپنا نظام تعلیم ہے، اپنی زبان ہے، اپنی پالیسیاں ہیں۔ یہاں تک کہ خود یورپ میں فرانس کے فرانسیسی، اٹلی کے اٹالین اور جرمنی کے جرمن انگریزی بولنے سے احتراز کرتے ہیں اور اپنی زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں کیونکہ اسی سے ان کی انفرادیت اور پہچان ہوتی ہے لہٰذا اہل پاکستان کو بھی اپنے دین، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنی تعلیم، اپنے علوم اور اپنی تعلیمی پالیسیوں پر عمل اور فخر کرنا چاہیے اور اس اصول کو کسی عقلی اور منطقی دلیل سے کوئی رد نہیں کرسکتا سوائے اس شخص کے جو امریکہ و یورپ کا ذہنی غلام ہو۔

ان دو اصولوں کو تسلیم کر کے کہ پاکستان کے نظام تعلیم کی اساس اسلامی ورلڈ ویو پر ہونی چاہیے اور مغربی ورلڈ ویو پر مبنی تعلیم رد کی جانی چاہیے (سوائے کچھ محتاط استفادے کے جو خصوصاً نیچرل سائنسز میں ہوسکتا ہے)۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سکول انتظامیہ کے پاس طلبہ کی اسلامی تعلیم و تربیت کے جو تین بڑے ذرائع ہیں (یعنی نصاب، اساتذہ اور ہم نصابی سرگرمیاں) ان میں اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے (تفصیل میں جانے کی بجائے ہم محض اشارات پر اکتفا کریں گے — تفصیلات کے لیے دیکھئے ہماری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل')۔

## ا۔ نصاب

۔ ہر سطح کی تعلیم کے تمام مضامین کے نصاب، نصابی کتب اور نصابی مواد کی تدوین نو تعلیم کے اسلامی مقاصد اور تناظر میں کی جائے اور ثنویت کا خاتمہ کیا جائے۔

۔ انگلش میڈیم کو فی الفور ختم کر کے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور انگریزی مڈل سے اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے، انگریزی ذریعہ تعلیم انتہائی غیر سائنسی اور تعلیمی لحاظ سے سخت نقصان دہ ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا بروشر 'انگلش میڈیم — فائدے اور نقصانات' جو خط لکھ کر بلا معاوضہ طلب کیا جا سکتا ہے)۔

- غیر مسلم اور غیر پاکستانی مؤلفین کی نصابی کتابوں کی بجائے معیاری نصابی کتب مقامی طور پر تیار کی جائیں اور غیر ملکی پبلشرز سے بھی معذرت کر لی جائے۔
- غیر ملکی یونیورسٹیوں اور امتحانی بورڈوں کے امتحانات (او اور اے لیول اور یونیورسٹیوں کے سپلٹ پروگرام) ختم کئے جائیں اور مقامی امتحانی نظام کو مؤثر بنایا جائے۔
- نصاب سارے ملک کے لیے یکساں ہونا چاہیے اور یہ شعبہ مرکز کے پاس رہنا چاہیے۔
- نصاب میں مؤثر دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہونا چاہیے (موجودہ نصاب خاصا ناقص ہے)
- طالبات کا نصاب ان کی صنفی ضرورتوں کے مطابق طلبہ سے الگ ہونا چاہیے

## ۲۔ اساتذہ

- تربیت کے بغیر کسی استاد کو پڑھانے کی اجازت نہ ہو۔
- تربیت میں فنی پہلو کے ساتھ اخلاقی اور دینی تربیت پر توجہ مرکوز کی جائے اور اساتذہ کو بتایا جائے کہ وہ اپنے طالب علموں کو عملی مسلمان کیسے بنائیں اور خود انہیں رول ماڈل بن کر کیسے دکھائیں ؟ کہ یہی ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔
- اساتذہ کی تنخواہیں اور معاشرتی حیثیت بڑھانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔ ایک سادہ فارمولہ یہ ہے کہ ان کی تنخواہیں اور آسائشات دگنی کر دی جائیں تاکہ ذہین اور محنتی لوگ اس شعبے میں آئیں۔

## ۳۔ انتظامی اقدامات/ ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں

- غیر ملکی یونیفارم ختم کر کے مقامی لباس کو رواج دیا جائے اور اسلامی روایات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔
- مخلوط تعلیم ختم کر دی جائے اور تدریسی سطح پر خواتین اور مردوں کا میل جول ختم کر دیا جائے۔
- تربیت کے لیے عملی اقدامات کئے جائیں

(تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی' اور پروفیسر محمد سلیم صاحب کی کتاب 'درسگاہ کی ہم نصابی سرگرمیاں')۔

سطور بالا میں ہم نے جن امور کی نشان دہی کی ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ صحیح وہی ہے اور اسی پر عمل ہونا چاہیے لیکن جب حکومت پاکستان ان باتوں پر عمل کرنے اور کرانے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر

ساری ذمہ داری پرائیویٹ سیکٹر پر آ پڑتی ہے اور دینی جماعتوں اور تحریکوں کا فرض ہے کہ وہ اس تعلیمی صورت حال کی اصلاح کے لیے کوششیں کریں اور تعلیم کے سارے شعبوں کی اسلامی تعلیمات کے مطابق اور مغربی تہذیب کے رد پر مبنی تنظیم نو کے لیے عملی اقدامات کریں مگر ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہماری دینی تحریکوں اور جماعتوں نے اس معاملے کی طرف کماحقہ، توجہ نہیں دی۔ حالانکہ اگر دینی تحریکیں اصلاح تعلیم کی طرف توجہ دیتیں تو وہ یہ کام کرسکتی تھیں اور ایسے تعلیمی ادارے قائم کرسکتی تھیں جو مالی طور پر منفعت بخش نہ بھی ثابت ہوتے تو وہ اصلاح کی خاطر اس مالی خسارے کو برداشت کرسکتی تھیں لیکن افسوس کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اب اس صورت حال میں کہ نہ حکومت نظام تعلیم وتربیت میں مندرجہ بالا دو اصولوں کی بنیاد پر اصلاح کے لیے تیار ہے اور نہ دینی تحریکیں و جماعتیں اس پر کماحقہ، توجہ دے رہی ہیں تو ہماری تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) کی طرح کے اکا دکا کم وسائل کے حامل اداروں کو چھوڑ کر باقی لوگ تعلیم میں ویسٹرنائزیشن قبول کرنے پر اور برائے نام اسلامائیزیشن کا ذکر کر دینے پر قانع ہو گئے ہیں۔ اس مجمع میں وہ لوگ جو ذاتی لحاظ سے دینی پس منظر رکھتے تھے یا کسی دینی تحریک سے وابستہ تھے جب وہ تعلیم میں بزنس کلچر کو قبول کر کے آئے تو اپنے دینی پس منظر کی وجہ سے نعرہ تو انہوں نے اسلامی تعلیم، اسلامی نظام تعلیم اور دین و دنیا کے حسین امتزاج وغیرہ کا لگایا لیکن عملاً وہ ویسٹرنائزیشن کے جال سے بچ نہ سکے اور Compromises پر اتر آئے اور انہوں نے مجبوری اور معاشرے کے دباؤ کے عنوان سے انگلش میڈیم، آکسفورڈ کی کتابیں، او اور اے لیول، مخلوط تعلیم، مغربی یونیفارم وغیرہ کو قبول کرلیا اور اپنا لیا۔ اس رویے کے جو نتائج نکلے وہ یہ ہیں:

۔ اس تضاد نے ان کو غیر مؤثر کر دیا کیونکہ نظریاتی اور نفسیاتی لحاظ سے تحرک اور فعالیت اسی وقت آتی ہے جب ذہنی اور فکری یکسوئی ہو اور یہاں اسی کا فقدان تھا۔

۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں نے ان Compromises کو فلاسیفائز کرنے کی کوشش شروع کردی اور کہنا شروع کر دیا کہ عصر حاضر میں اسلامی تعلیم کا صحیح تصور اور طریقہ ہی یہ ہے اور یہ کہ اسلام زمانے کے ساتھ چلنے سے منع تو نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگرچہ ایسے لوگ اسلامی تحریکوں، تنظیموں کی پبلک میٹنگوں میں مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن اپنے نجی حلقے میں اور اپنے تعلیمی اداروں میں وہ اپنے نقطۂ نظر کو مدلل بنا کر پیش کرتے اور اپنے رویے کو justify کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔

۔ اس رویے کا حتمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس نے مسلم معاشرے میں مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے مرعوبیت پیدا کی ہے، معاشرہ مغرب زدہ ہو رہا ہے اور مسلم معاشرے میں مغرب کے علمی، فکری تعلیمی اور تہذیبی غلبے کی راہ ہموار ہوئی ہے اور ان شعبوں میں اسلامی فکر وتہذیب پسپا ہوئی ہے۔

۔ ان دینی عناصر کے ادارے (سول سوسائٹی کے دیگر تعلیمی اداروں سے مل کر) مغربی اثرات کے تحت مسلم معاشرے کی اس معاشی و معاشرتی طبقہ واریت کو مستحکم کر رہے ہیں جن کی بنیاد نظام سرمایہ داری پر ہے اور جس میں ہر سطح کا نچلا طبقہ معیار زندگی کی دوڑ میں اوپر والے طبقے میں شامل ہونا چاہتا ہے اور جیسا کہ تفصیلاً ذکر آرہا ہے کہ اوپر کا ہر طبقہ مغرب زدگی میں آگے بڑھ رہا ہے اور اسلامیت میں پیچھے آرہا ہے۔

۔ بعض اوقات یہ تضاد بھی سامنے آتا ہے کہ ایک دینی تحریک یا جماعت سیاسی سطح پر مغرب کی مخالفت کر رہی ہوتی ہے لیکن تعلیمی سطح پر وابستہ افراد اور ان کے ادارے مغربی نظام تعلیم کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہماری رائے میں یہ نتیجہ ہے ایمان کی کمزوری کا اور مغربی فکر وتہذیب کے غلبے اور اس کے اثرات کو قبول کرنے کا (خواہ وہ لاشعوری ہی کیوں نہ ہو)۔ اگر اخلاص ہوتا اور ایمان مضبوط ہوتا تو ان دینی عناصر کو چاہیے تھا کہ مسلم نظام تعلیم میں مغرب کے اثرات کی مزاحمت کرتے اور اسی بنیاد پر اپنے تعلیمی ادارے چلاتے۔ اس سے ممکن ہے ان کو آمدنی کم ہوتی لیکن اس ایثار سے معاشرہ اسلام کے قریب آتا اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب سے دور ہوتا اور ہمیں یقین ہے کہ اگر ان عناصر کا رویہ مستحکم رہتا اور اس میں تسلسل رہتا تو جلد یا بدیر معاشرہ بھی ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے لگتا اور جدید تعلیم کو اسلامی تناظر میں دینے کے عمل کو اسلامی کاز سمجھنے لگتا اور یوں معاشرے کی حمایت ان عناصر کو میسر آجاتی۔ ہمارے معاشرے میں دینی مدارس کا کامیابی سے چلتے رہنا بلکہ ان میں دن بدن اضافہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ قوم تعلیم کے جس کام کو 'دینی' سمجھتی ہے اس کے لیے پھر مالی وسائل کی کمی نہیں رہتی۔ لیکن بدقسمتی سے ان دینی عناصر نے اپنے مؤقف پر قائم رہ کر اسے عوام میں پھیلانے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی بجائے تعلیم میں مغربی تہذیب کا بزنس کلچر اور فیسوں اور ٹیوشنوں کا نظام قبول کر لیا جس کے نتیجہ میں اسلام تو آیا نہیں (اور منطقی طور پر آنا بھی نہیں چاہیے تھا) البتہ مغربیت سکہ

رائج الوقت بن چکی ہے اور معاف کیجیے گا مغرب زدگی کا مطلب ہے اسلام کی نفی اور دیس نکالا اور مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور کافرانہ اقدار کا غلبہ (جاری ہے)۔

محمد عاصم حفیظ

# دینی طبقہ پرنٹ میڈیا کو کیسے استعمال کرے؟

پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات، رسائل و جرائد وغیرہ اہم ترین ذرائع ابلاغ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دینی حلقے زیادہ تر اسی پر انحصار کرتے ہیں جبکہ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ہمارے ملک میں سیکڑوں کے حساب سے دینی جرائد شائع ہوتے ہیں۔ اخبارات دینی ایڈیشن شائع کرتے ہیں جبکہ اہم مذہبی تہواروں کے موقعہ پر بھی خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تصاویر کے معاملے پر معمولی اختلاف کے علاوہ دینی طبقہ اس قسم کی صحافت میں کافی حد تک دلچسپی رکھتا ہے اور شائد یہی وجہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کی سب سے زیادہ سرگرمی بھی اسی میدان میں نظر آتی ہے۔ بہت سی جماعتوں نے اپنے اخبارات جاری کرنے کے تجربات بھی کیے ہیں جو کہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں جبکہ علمائے کرام اور دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد دیگر اخبارات اور رسائل کے لیے بھی دینی مواد فراہم کرتے رہتے ہیں جس سے عوام الناس کو یقینا فائدہ پہنچتا ہے۔ ان سب کوششوں کے باوجود اب بھی پرنٹ میڈیا کے میدان میں محنت کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے۔ مذہبی جماعتوں کے شعبہ نشر و اشاعت اور مختلف دینی رسائل کے ذمہ داران بغیر کسی پیشہ ورانہ تربیت کے اس کام سے منسلک کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ آج کے اس دور میں کہ جب ذرائع ابلاغ کا شعبہ انتہائی اہمیت اختیار کر چکا ہے دینی اور مذہبی جماعتیں شعبہ نشر و اشاعت میں محض خانہ پری کے لیے تقرریاں کرتی ہیں یعنی جس کسی اہم بندے کے لیے کوئی بھی عہدہ نہ بچے تو اسے شعبہ نشر و اشاعت کا ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض بڑی مذہبی جماعتوں کے شعبہ نشر و اشاعت بھی کچھ زیادہ سرگرمی دکھانے میں ناکام رہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اپنے رہنماؤں کی خبریں چھپوانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پاکستانی پرنٹ میڈیا کا سٹرکچر کچھ ایسا ہے کہ اس میں حکومتی عہدیداروں کے علاوہ سیاسی، مذہبی اور دیگر شخصیات کو اپنے

آپ کو خبروں میں رکھنے کے لیے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خبریں چھپوانے کے لیے رپورٹرز کی خوشامد اور بعض مواقع پر رشوت بھی دی جاتی ہے۔ خیر بہت سی جماعتیں اس قسم کا خرچہ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اس لیے ان کے رہنما ہمیشہ خبروں میں رہتے ہیں۔

ایک اور بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں کبھی بھی دعوتی حوالے سے مفید ثابت نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کی نوک پلک سنوارنے والے سب ایڈیٹرز ہر خبر کو بے ضرر اور سیاسی ماحول کے مطابق بنا دیتے ہیں۔ اخبار کی خبر نظریاتی پیغام کو واضح نہیں کرتی۔ اس سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بعض رہنما اپنے بیانات کے ذریعے عوامی مقبولیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معمول یہی ہے کہ اخبار میں خبر صرف مشہور علمائے کرام اور سیاست سے منسلک مذہبی رہنماؤں کی ہی چھپتی ہے جبکہ دینی تبلیغ اور خالص علمی کاموں میں مصروف علمائے کرام کو خبروں میں بالعموم جگہ نہیں مل سکتی۔ اس وضاحت کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اخبارات میں بیانات چھپوانے کے لیے دکھائی جانیوالی سرگرمی دینی اور مذہبی جماعتوں کے اصل مقصد کے لیے کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی۔ اس سے ہرگز یہ مراد بھی نہیں کہ دینی جماعتوں کے عہدیداران اور مذہبی رہنما بالکل ہی اس سے لاتعلق ہو جائیں بلکہ میرا مقصد تو بس یہ کہنا ہے کہ دینی جماعتوں کو چاہیے کہ صرف بیانات چھپوانے کے لیے ہی کوششیں نہ کی جائیں۔ دینی حلقے پرنٹ میڈیا سے بے پناہ فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ دینی جماعتوں کے جاری کردہ اخبارات اور رسائل تو ان کے پیغام کے عکاس ہوتے ہی ہیں جبکہ دیگر اخبارات اور جرائد کو بھی دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ دینی جماعتیں اپنے زیر انتظام چلنے والے اخبارات اور جرائد کو معیاری بنائیں۔ ان کی تیاری اور اشاعت کو بہتر بنانے کے لیے پیشہ ورافراد کا تقرر کیا جائے۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ کسی دینی رسالے کو چلانے اور اس کی تیاری وغیرہ کا کام بھی رضا کارانہ طور پر کارکنوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ تحریریں مختلف قارئین روانہ کر دیتے ہیں یا پھر زیادہ تر مختلف کتابوں سے اخذ کردہ مواد ہی قسط وار مضامین کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ بہت کم دینی رسائل اور اخبارات ایسے ہیں کہ جن میں قارئین کو ان کی ضرورت کے مطابق اور نیا مواد پڑھنے کو ملتا ہے۔ ان رسائل کو تیار کرنیوالے افراد کے اخلاص پر تو شک نہیں کیا جا سکتا لیکن پیشہ ورانہ تربیت کی کمی اور تحریروں کو عوامی مزاج کے مطابق نہ ڈھالنے کے باعث دینی رسائل زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر پاتے اور اکثر ایک محدود طبقے تک ہی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دینی رسائل

میں زیادہ تر تحریریں مشکل پیرائے میں لکھی گئی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کے لیے زیادہ کشش نہیں رکھتیں۔ اشتہارات کی کمی اور وسائل نہ ہونے کے باعث دینی رسائل مشکل سے ہی معیار برقرار رکھ پاتے ہیں۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ دینی طبقہ سب سے پہلے تو اپنے زیر انتظام ہونے والی صحافت کو لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنائے۔ دینی رسائل کا اسلوب زیادہ سے زیادہ عوامی بنایا جائے تاکہ یہ رسائل زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی حاصل کرسکیں۔ بڑی دینی جماعتیں اور اچھی مالی حیثیت رکھنے والے دینی اخبارات کے لیے مذہبی رجحان رکھنے والے پیشہ ور افراد کو متعین کیا جائے۔ یا پھر پہلے سے مقرر عملے کے لیے صحافتی اصول وضوابط اور پراپیگنڈا کے طور طریقوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ دینی رسائل میں چھپنے والی ہر ایک تحریر کو خوب جانچ پرکھ کر آسان فہم بنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔ اس کے لیے بعض نامور لکھاریوں سے بھی تحریریں لکھوائی جاسکتی ہیں یا ان سے ایڈیٹنگ کے سلسلے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ تحریروں کو زیادہ پرکشش بنانے کا فن جانتے ہوتے ہیں جبکہ موضوعات کے انتخاب کے سلسلے میں بھی مفید رہنمائی فراہم کرسکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انہیں کُل وقتی ملازم ہی رکھا جائے بلکہ ان سے جز وقتی کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اچھے لکھاری دینی حلقے سے عقیدت تو رکھتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے حوالے سے کوئی میدان عمل موجود ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے دینی جماعتوں کو چاہیے کہ میڈیا کے شعبوں کو مضبوط بنائیں تاکہ ایسے افراد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

دوسری جانب وسائل کی کمی اور محدود رسائی کی وجہ سے دینی رسائل کے لیے تازہ مواد کی فراہمی انتہائی دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر رسالے کے ذمہ دار کو چاہیے کہ وہ اپنے وسائل کے لحاظ سے ایک پالیسی ترتیب دیں۔ اگر ممکن ہو تو کسی اچھے، تربیت یافتہ اور دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے صحافی کو ہی رسالے کی ادارت دی جائے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو اپنے بندوں کے لیے تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ دیگر اخبارات اور رسائل کی طرح دینی جرائد کے بھی مختلف علاقوں میں نمائندگان کا تقرر کریں جو کہ نہ صرف ان کی اشاعت بڑھانے کا باعث بنیں گے بلکہ مواد کی فراہمی کا بھی باعث ہوں گے۔ جس طرح اخباری نمائندگان سرکاری، سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجتے ہیں بالکل اسی طرح دینی رسائل کے نمائندگان دینی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجیں جبکہ اس سے بھی ضروری یہ ہے کہ اپنے علاقے کے اہل علم سے اچھی تحریریں لکھوائیں۔ یہ نمائندگان

رسالے کا تعارف کرائیں اور اپنے نظریے کے حامل پڑھے لکھے افراد اور علمائے کرام کو رسالے کے لیے مواد فراہم کرنے پر راضی کریں۔ اس طرح دینی رسائل کے لیے کافی زیادہ تازہ مواد مل سکتا ہے جس سے یقیناً لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھے گی۔ ان نمائندگان کی رسالے کے لیے اہل علم، دینی رہنماؤں، بزرگوں اور اہم علمائے کرام کے انٹرویوز وغیرہ کرنے کی ڈیوٹی بھی لگائی جاسکتی ہے۔ دینی جماعتوں کے کارکنان بغیر کسی معاوضے کے یہ ذمہ داری نبھانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ صرف ان کو چند بنیادی باتوں سے متعلق تربیت فراہم کر دی جائے۔ انٹرویوز وغیرہ کے لیے ان کو سوالنامہ ایڈیٹر (مدیر) کی جانب سے بھی بھیجا جاسکتا ہے جبکہ ان کی تحریروں کو مزید بہتر اور قابل اشاعت بنانے کی ذمہ داری بھی آخرکار ایڈیٹر کی ہی ہوگی۔

مذہبی رسالے کی اشاعت کے ذمہ دار افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات حاضرہ سے بخوبی آگاہ ہوں اور خالص دینی احکام ومسائل کے ساتھ دیگر موضوعات پر بھی مواد شامل کریں۔ مذہبی جماعتوں کو چاہیے کہ اپنے رسائل میں دینی مسائل کی علمی بحثوں کے ساتھ ساتھ عوامی مزاج کے مطابق تحریریں بھی شائع کریں۔ یعنی کچھ رسائل تو علمی سطح کے ہوں جبکہ بعض کو عوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک ہی رسالے میں علمی مباحث اور عوامی تحریروں کو جمع کر دیا جائے۔ دینی رسائل اور اخبارات کو معاشرے کی ضرورتوں کے لحاظ سے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لادین اور سیکولر طبقہ لوگوں کی توجہ دین سے ہٹانے کے لیے پرنٹ میڈیا کو بھرپور طریقے سے استعمال کر رہا ہے۔ دینی طبقہ کو بھی چاہیے کہ ان کے بنائے گئے معیارات کو بدلنے کی کوشش کرے۔ لوگوں کے لیے ایسا متبادل اور دلچسپ مواد پیش کیا جائے جو ایک طرف دینی تقاضوں کو پورا کرتا ہو تو دوسری جانب اس قدر دلچسپ اور عوامی نوعیت کا بھی ہو کہ بڑے پیمانے پر پڑھا جائے۔ انشاء اللہ اس بارے میں اسلامی پروپیگنڈا کے باب میں مزید بحث کی جائے گی۔ دینی رسائل کے ایڈیٹرز معاشرتی مسائل کو زیر بحث لائیں اور ان کے متعلق دینی موقف واضح کریں۔ اپنے قارئین کو عالمی حالات سے آگاہ رکھیں اور رسالے کو متنوع موضوعات سے مزین کریں۔ بچوں، خواتین اور نوجوان طبقے کے لیے مواد کی تیاری ایسی ہونی چاہیے کہ جو انہیں اسلامی روایات کا پاسدار بنانے اور دینی احکام و مسائل کا پابند بنانے میں مددگار ہو۔ اس مقصد کے لیے اخلاص، دینی علم، بھرپور محنت کے ساتھ ساتھ تربیت اور پیشہ ورانہ اصول وضوابط پر عمل پیرا ہونے کی بھی ضرورت ہے۔ نظریات، عقائد، اسلامی روایات اور دیگر مذہبی احکام و مسائل کو بدلنے کی نہیں بلکہ ان کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اور

جس دن اسلامی تحریکوں نے پرنٹ میڈیا کا ایسا استعمال شروع کر دیا کہ جس کے ذریعے عوام کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا جا سکے تو یقیناً اس سے ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو گی۔ بعض دینی رسائل اور اخبارات اس میدان میں اچھی کارکردگی دیکھا رہے ہیں۔ اگر دیگر حلقوں میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو جائے جبکہ پہلے سے موجود افراد اپنی محنت میں اضافہ کر دیں تو یقیناً بہت ہی مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح موجود پرنٹ میڈیا کو دینی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال بھی کافی اہم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان سمیت کہیں بھی پرنٹ میڈیا کو روزانہ ہی کافی زیادہ تازہ مواد کی ضرورت ہوتی ہے۔ خبروں کے علاوہ اخبار یا رسائل کے دیگر حصوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کالم، رنگین صفحات، ایڈیشنز، خصوصی اشاعتیں اور دیگر سلسلوں کے لیے دینی سوچ اور فہم رکھنے والے افراد کو مواد فراہم کرنا چاہیے۔ دینی جماعتوں کے شعبہ نشر و اشاعت کو چاہیے کہ خبریں چھپوانے کے علاوہ اس طرف بھی توجہ دیں۔ پاکستانی اخبارات میں ہر جمعتہ المبارک کے دن دینی ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دینی حلقے تمام اخبارات کے ان دینی ایڈیشنز کے لیے ہی مضامین اور عوامی دلچسپی کا مواد فراہم نہیں کر پاتے۔ اکثر ان ایڈیشنز میں مختلف بڑے علماء کرام کی کتابوں کو ہی قسط وار شائع کیا جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے پڑھے لکھے افراد اور علمائے کرام باقاعدگی سے ان ایڈیشنز میں لکھا کریں۔ حالات حاضرہ کے مطابق اور ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن سے اخبار کے قارئین زیادہ متاثر ہوں مثلاً اگر یورپ میں حجاب پر پابندی کا مسئلہ درپیش ہے تو اخبارات کے دینی ایڈیشنز میں دلائل کے ساتھ اسلامی موقف واضح کیا جائے نہ کہ ان دینی ایڈیشنز میں کسی حج و عمرے سے متعلق مسائل کی کتاب کو قسط وار شائع کیا جا رہا ہو۔ معاشرتی برائیوں کو اسلامی نقطہ نظر سے بیان کیا جائے۔ کرپشن کے قصے اگر اخبار کی خبروں میں ذکر ہو رہے ہیں تو دینی ایڈیشن میں بدعنوانی، جھوٹ، رشوت اور اقربا پروری سے متعلق اسلامی احکامات کا تذکرہ ہو۔ اخبارات میں دینی ایڈیشن کے انچارج کو تو اپنا صفحہ بروقت تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ معاشرے کی دینی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے مواد تلاش کرے۔ یہ ذمہ داری تو دینی جماعتوں کی ہے کہ وہ ایسے مسائل جو معاشرے میں لادینیت پھیلا رہے ہیں یا جن سے اسلامی روایات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے انہیں زیر بحث لائیں۔ اسی طرح سنڈے میگزین میں بھی ایک خاص حصہ دینی مضامین کے لیے مختص ہوتا ہے۔ اس میں بھی اچھے مضامین شائع کرائے

جا سکتے ہیں ۔ سنڈے میگزین میں کافی زیادہ جگہ میسر ہوتی ہے اور اس میں مواد شائع کرانا انتہائی آسان ہوتا ہے ۔ اس کے موضوعات بھی سیاسی سے زیادہ معاشرتی طرز کے ہوتے ہیں جبکہ دینی موضوعات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے ۔مثلا اسلام میں عورت کا مقام ، اسلام کا نظریہ تفریح ، اسلام اور مغرب کی کشمکش ، مغرب کی اسلام مخالف سازشیں ،صہیونیت کا کردار ، اسلام کا خاندانی نظام ، معاشرتی تبدیلی میں علمائے کرام کا کردار ، مختلف علمائے کرام کے واقعات ، ان کا تعارف وغیرہ وغیرہ ۔اخبارات کی جانب سے مختلف دنوں کی مناسبت اور تہواروں کے موقعہ پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ اگر دینی جماعتوں کے شعبہ نشر واشاعت سے منسلک افراد کو اس کا احساس ہوتو پہلے سے ہی ان کے لیے مضامین لکھوائے جا سکتے ہیں ۔ یا پھر علمائے کرام بھی اس کا خیال رکھ سکتے ہیں کہ چند روز بعد فادرز ڈے ، مدرز ڈے ، مزدوروں کا دن ،تمباکو نوشی کے خاتمے کا دن ، منشیات کے خلاف دن آنے والے ہیں ۔ ان کے لیے پہلے سے ہی اسلامی تعلیمات کے مطابق مضمون لکھ کر اخبارات کو ارسال کیے جائیں ۔یقین مانیں کہ یہ مضامین ضرور شائع ہوں گے اور اس طرح عوام کو یہ بھی احساس ہو گا کہ دینی طبقہ معاشرے کی ضروریات سے آگاہ ہے اور ایسے مسائل کو بھی زیر بحث لانے کی صلاحیت رکھتا ہے جو موجودہ دور میں انسانی زندگی کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں ۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ منشیات ،تمباکو نوشی ، ماں اور باپ کے دن وغیرہ کے حوالے سے صرف لادین اور مغرب زدہ طبقہ ہی سرگرم نہ ہو بلکہ ان مواقع کو اسلامی تعلیمات کے فروغ اور لوگوں میں دین سے متعلق شعور کی بیداری کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ ہمارے ہاں بہت سے حلقے ایسے دنوں کی مخالفت میں ہی پورا زور لگا دیتے ہیں حالانکہ ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے ۔ ہاں البتہ کچھ ایسے تہوار اور دن کہ جو اسلامی تعلیمات کے صریح مخالف ہوں اور ان سے بیہودگی اور فحاشی وغیرہ کا تاثر ملتا ہو یعنی ویلنٹائن ڈے ، نیو ائیر نائٹ وغیرہ تو ان کی بھر پور طریقے سے مخالفت بھی کی جا سکتی ہے ۔لیکن یہ مخالفت صرف آپس میں بحث و تکرار تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ان تہواروں کو معاشرے کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت کرنے کے حوالے سے بھر پور مہم چلائی جائے اور میڈیا میں مواد فراہم کیا جائے ۔ ان دنوں کے خلاف اسلام اور معاشرتی زندگی کے لیے نقصان دہ ہونے کے حوالے سے مضامین شائع کیے جائیں ۔ اگر دینی سمجھ بوجھ رکھنے والے کسی لکھاری کا مضمون علمی نوعیت اور موقف کی بھر پور ترجمانی کرتا ہو گا تو ضرور شائع ہو جائے گا ۔ اور اگر مضامین ، رنگین صفحات اور سنڈے میگزین وغیرہ میں نہ شائع ہونے کا خدشہ ہو تو اسے ایڈیٹر کے نام خط کے طور پر بھیج دینا

چاہیے۔ اخبارات ایڈیٹرز کے نام خط کے کالم میں ہر قسم کا موقف پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایڈیٹر کے نام خط بھی ایک اہم جگہ ہے جہاں آپ اپنا موقف واضح کر سکتے ہیں اور اس کالم کو کافی زیادہ پڑھا بھی جاتا ہے۔ دینی طبقے سے منسلک افراد کو چاہیے کہ وقفے وقفے سے معاشرتی مسائل، دین سے دوری، بے راہ روی، تہذیب کی بربادی، فحاشی وعریانی اور ایسے ہی مسائل کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی تحریریں ایڈیٹر کے نام خط میں لکھتے رہیں جو کہ زیادہ تر شائع ہو جاتی ہیں اور بہت سے لوگ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ سنڈے میگزین وغیرہ میں دین سے دوری اور معاشرتی بگاڑ سے متعلق واقعات بھی ارسال کیے جا سکتے ہیں (جاری ہے)۔

**تفہیم مغرب (ڈائیلاگ)** حمیرا رانا

# مسلم ترقی کے لیے مغربی سائنس و ٹیکنالوجی ناگزیر ہے

البرہان نے جنوری ۲۰۱۱ء میں سائنس و ٹیکنالوجی پر ایک طویل مجلس مذاکرہ کی رپورٹ شائع


## دی چلڈرن قرآن سوسائٹی، لاہور

پچھلے ۴۴ سال سے سکولوں میں طلبہ و طالبات کی اسلامی تعلیم و تربیت اور انہیں قرآن حکیم سے مربوط کرنے کے لیے فی سبیل اللہ جدوجہد کر رہی ہے۔ ہر سکول کو چاہیے کہ سوسائٹی کا ماہانہ رسالہ کوثر (سالانہ چندہ/-۱۵۰ روپے) اور اس کی طبع کردہ بچوں کے لیے ۳۱ دلچسپ کتابوں کا سیٹ اپنی لائبریری کے لیے خرید کر طلبہ و طالبات کو مہیا کرے۔ مزید تفصیلات کے لیے:

### دی چلڈرن قرآن سوسائٹی

17۔ وحدت روڈ لاہور، فون 042-3759 8565
صفہ پبلشرز A-19 ایبٹ روڈ، لاہور، فون 042-36307269
ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب، فون 042-37281939

کی۔ پھر مارچ اور اپریل کے شماروں میں ڈاکٹر نعمان ندوی صاحب کا مضمون شائع کیا جس میں مغربی سائنس و ٹیکنالوجی پر تنقید کی گئی تھی۔ اس شمارے میں دو نوجوانوں نے اس کے خلاف مختصر ردعمل ظاہر کیا ہے۔ کوئی اہل علم اس بحث میں حصہ لینا چاہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے۔ امین

مغربی تہذیب آج کل دنیا پہ چھائی ہوئی ہے اور ساری دنیا پر اس کا غلبہ ہے۔ ہر تہذیب اسی تہذیب کے زیر اثر ہے۔ مغربی تہذیب نے جتنی ترقی کی ہے اس حوالے سے ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب ہی وہ راستہ ہے جو ترقی کی طرف جاتا ہے۔ دنیا میں اگر نظر دوڑائیں تو ہر میدان میں اہل مغرب نے ترقی کی ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ، تعلیم وغیرہ میں اور ان کے بتائے گئے سیاسی نظام کامیابی سے چل رہے ہیں۔

ہیومنزم کے تصور نے انسان کو، جو اس کائنات کا مقصد ہے، ترقی دی اور سائنس نے انسان کی ترقی کے لیے اور اس کی آسائش کے لیے نت نئی ایجادات کیں۔ کمپیوٹر، الیکٹرانک کی گھریلو استعمال کی چیزیں، ہوائی جہاز۔۔۔وغیرہ۔ اس نے انسان کے سکھ کے لیے اور سہولت کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جن کے بغیر انسان آج کل زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ انسان اگر اس جدید ٹیکنالوجی کو، جو مغربی تہذیب کی پیداوار ہے، چھوڑ دے تو وہ انسانی ترقی کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور بہت پیچھے رہ جائے گا کیونکہ مغربی تہذیب نے ہی اس کو جدید سہولیات سے آراستہ کیا ہے۔ ایٹمی ٹیکنالوجی وہ ہے جس کے بغیر انسان قوت حاصل نہیں کرسکتا اور کسی بھی وقت دوسرے ملک کے قبضے میں جاسکتا ہے، گویا اس تہذیب کی جدید ٹیکنالوجی کو اپنائے ہوئے انسان اپنے ملک کی بقاء اور تحفظ کا باعث بن سکتا ہے۔ انٹرنیٹ جو انسان کو گھر بیٹھے جدید معلومات اور تازہ خبروں سے آگاہ رکھتا ہے اب ہر گھر کی ضرورت بن گیا ہے۔ اس سے تعلیمی میدان میں بھی ترقی کی جاسکتی ہے۔ آج کل کے دور میں اس کے بغیر تعلیمی ترقی ادھوری ہے کیونکہ اب کم وقت میں زیادہ معلومات حاصل کرنا ہوتی ہیں جو اس جدید دور کا تقاضا ہے۔ بیرون ملک لوگوں سے رابطہ اور وہاں کے حالات سے آگاہی بھی اسی مغربی تہذیب کی ٹیکنالوجی کی بدولت ہے۔

اگر ہم مغربی تہذیب کے تعلیمی نظام کو، جو آج کل ہر طرف چھایا ہوا ہے، چھوڑ دیں تو ہم دنیا میں ترقی نہیں کرسکتے۔ اور ان کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم سائنسی، سیاسی، معاشی ہر میدان میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ آج کل کی جو مغربی معاشی پالیسیاں ہیں وہ انسان کے معاشی مستقبل کے لیے

بہت افادیت رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تہذیب پر یا ان کی پالیسیوں پر عمل نہ کریں تو معاشی ترقی نہیں کر سکتے۔

اس لیے ہمیں دنیا میں ترقی کے لیے مغربی تہذیب کے طور و اطوار کو اپنانا ہوگا تا کہ ہم بھی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوں اور جدید سہولیات سے فائدہ اٹھائیں کیونکہ انسان اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہ دوسروں سے آگے بڑھنے کی لگن رکھے اور مثبت پہلو کو اپنائے۔ اس لیے میری رائے میں مغربی تہذیب کا جو منہاج ہے وہ عصر حاضر میں ترقی کے لیے ناگزیر ہے ورنہ ہم ہر میدان میں پیچھے رہ جائیں گے اور اس منہاج پر عمل کر کے ہی ہم دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

سہیل احمد

## مغربی تہذیب کی پیروی میں کوئی حرج نہیں

تہذیب نتیجہ ہوتی ہے انسانی رویوں کا اور ایک کامیاب تہذیب کا مطلب ہی ترقی ہوتا ہے کیونکہ وہ نتیجہ ہوتی ہے ترقی کے لیے پیدا کردہ مناسب ماحول کا۔

مسلمان اِن انسانی رویوں (Humanist behaviour) سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو اہل مغرب نے اپنا رکھے ہیں مثلاً وہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا احترام کرتے ہیں یہاں تک کہ جانوروں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ رویے اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں لہٰذا مسلمان اگر ان جیسے رویوں میں اہل مغرب کی پیروی کریں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟

مغرب نے انقلابی تبدیلیوں کو قبول کر لای اس لیے وہ ترقی کی معراج پانے میں کامیاب ہو گئے سوال یہ ہے کہ مسلمان کیوں اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں لانے پر غور نہیں کرتے؟ مثلاً یہ دیکھیے کہ ہمارے ہاں 'اولڈ ہومز' نہیں ہیں لیکن ہمارے ہاں شرح اموات اہل مغرب سے کہیں زیادہ ہے۔ مغرب میں بہت سے لوگ نوے اور سو سال کی عمر پاتے ہیں کیونکہ وہ ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے ہیں اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر مسلمان اس معاملے میں اہل مغرب کی تقلید کریں تو اس میں کیا بُرائی ہے؟

مسلم معاشرے میں خواتین پردہ کرتی ہیں جب کہ مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پردے سے اصل مقصود کیا ہے؟ میری رائے میں یہ کہ مناسب حدود کے اندر رہ کر کام کیا جائے اب دیکھیے کہ مغرب میں خواتین کو اکثر معاملات میں مثلاً کھیلوں، تعلیم، ملازمتوں اور تجاورت وغیرہ میں مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں یوں ان کی صلاحیتیں قومی ترقی میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے بالمقابل ہم مسلمان اپنی خواتین کو پڑھانے لکھانے کے بعد گھروں میں بٹھا لیتے ہیں اور یوں ان کی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

مسلمان معاشرے میں والدین چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ہمشیہ ان کے ساتھ رہے اور جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات ناخلف اولاد ان کی خدمت نہیں کرتی اور وہ در در کے دھکے کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل مغرب اپنی اولاد کی تربیت آزادانہ ماحول میں کرتے ہیں اور بچوں پر بے جا پابندیاں نہیں لگاتے نتیجتاً بچوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور آزاد زندگی گزارنے میں ان کو کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

یہ اور اسی طرح کی بہت خوبیاں ہیں جو مغربی معاشرے میں موجود ہیں لیکن مسلم معاشرے ان سے محروم ہیں۔ ان معاملات میں اگر مسلمان مغربی تہذیب کی پیروی کریں تو میری طالب علمانہ رائے میں اس میں کوئی ہرج نہیں۔

# ملی مجلس شرعی

## انتخابات، قراردادیں اور کمیٹیاں

**مختصر تعارف:** ۱۳اگست ۲۰۰۷ء کو ڈاکٹر محمد امین صاحب کی تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے زیر اہتمام گلبرگ کے ایک سکول میں دینی مدارس کے علماء کرام کی ایک ورکشاپ میں یہ خیال سامنے آیا کہ ایک علمی وفکری مجلس ایسی ہونی چاہئے جس میں تمام مکاتب فکر کے ثقہ علماء کرام شریک ہوں اور جس میں عصری حوالے سے اسلامی معاشرے کو درپیش جدید مسائل پر غور وخوض کیا جاسکے تاکہ عوام کو اسلامی حوالے سے جدید مسائل میں آگہی ورہنمائی میسر آسکے اور مسلکی سطح سے اوپر اٹھ کر علماء کرام کا ایک مشترکہ اوراجتماعی مؤقف سامنے آسکے جس سے اتحاد امت اور بین المسالک ہم آہنگی کو فروغ ملے۔ چنانچہ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۹اگست ۲۰۰۷ء کو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں ایک تاسیسی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں 'ملی مجلس شرعی' کے نام سے ایک علمی وفکری مجلس کی بناء ڈالی گئی اور اتفاق رائے سے مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی شہید کو مجلس کا کنوینر اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کو رابطہ سیکرٹری بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

مجلس اب تک مندرجہ ذیل موضوعات پر تمام مکاتب فکر کے جید اور ثقہ علماء کا مشترکہ مؤقف سامنے لاچکی ہے:

۱۔ تصویر اور ٹی وی کی شرعی مقاصد کے لئے استعمال کی اجازت (مطبوعہ ماہنامہ محدث شمارہ جون ۲۰۰۸ء)

۲۔ دینی مدارس کے نظام اور نصابات کی اصلاح

۳۔ پاکستان معاشرے میں بڑھتی ہوئی عریانی وفحاشی کے انسداد اور حیاء وعفت کے فروغ کے لئے پرامن جدو جہد کو منظم ومتحرک کرنا۔

۴۔ دینی تنظیموں، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو متوجہ کرنا کہ وہ قومی خود مختاری کے تحفظ اور پاکستان سے غیر ملکی اثرات کے خاتمے کے لئے ایک پرامن عوامی تحریک چلائیں۔

۵۔ مجلس نے تقریباً ایک سال کی محنت سے پاکستان میں متفقہ تعبیر شریعت اور نفاذ شریعت کے متفقہ رہنما اصول وضع کیے ہیں تاکہ اس حوالے سے موجود کنفیوژن ختم ہو اور حکمرانوں، سیاست دانوں، علماء کرام اور عامۃ الناس کو ایک واضح ڈائریکشن مل جائے۔

مجلس کا مستقبل کا ایک منصوبہ اتحاد بین العلماء کا بھی ہے تاکہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کے درمیان بُعد اور اختلاف کم ہو اور فکری ہم آہنگی اور اتحاد وتعاون میں اضافہ ہو۔ مجلس مستقبل میں

اپنا دائرہ کار پورے ملک تک وسیع کرنا چاہتی ہے اور اپنا مرکز بنانا چاہتی ہے جس میں بحث و تحقیق کی سہولت بھی ہو اور جس میں سارے دینی مکاتب فکر کے مشترکہ اہداف کے مطابق نشر و اشاعت اور تعلیم و تربیت کا سامان بھی ہو۔

**انتخابات:** مجلس کے تاسیسی اجلاس میں جن علماء کرام نے شرکت کی تھی ،ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں : مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی شہید۔ مولانا مفتی محمد خان قادری۔ مولانا حافظ فضل الرحیم۔ مولانا زاہد الراشدی ( گوجرانوالہ ) ۔مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی ۔مولانا عبد الما لک ( منصورہ ) مولانا محمد صدیق ہزاروی۔ مولانا عبد الرؤف فاروقی ۔ مولانا ارشاد الحق اثری ( فیصل آباد )۔مولانا حافظ صلاح الدین یوسف ۔ پروفیسر محمد رفیق چودھری۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین۔

مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شہادت کے بعد مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب کو کنوینر مقرر کیا گیا جب کہ ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء کے اجلاس میں اتفاق رائے سے مجلس منتظمہ کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں درج ذیل عہدیداران کا بھی تقرر کیا گیا:

| | | | |
|---|---|---|---|
| **صدر** | مولانا مفتی محمد خان قادری | **سینئر نائب صدر** | مولانا زاہد الراشدی |
| **نائب صدر** | مولانا عبدالغفار روپڑی | **نائب صدر** | مولانا عبدالما لک |
| **نائب صدر** | علامہ محمد حسین اکبر | **ناظم اعلیٰ** | ڈاکٹر محمد امین |
| **نائب ناظم اعلیٰ** | مولانا خلیل الرحمن قادری | **ناظم مالیات** | مولانا راغب حسین نعیمی |
| **ناظم نشر و اشاعت** | مولانا شیخ محمد یعقوب | | |

## ارکان مجلس منتظمہ

| | | |
|---|---|---|
| مولانا حافظ فضل الرحیم | مولانا عبدالرؤف فاروقی | علامہ احمد علی قصوری |
| مولانا عبدالرحمن مدنی | حافظ عاکف سعید | ڈاکٹر فرید احمد پراچہ |

# قراردادیں

ملی مجلس شرعی کے تحت سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۸ مئی ۲۰۱۱ء

میں مندرجہ ذیل قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کیں:

## قرارداد ۱ قومی خودمختاری کا تحفظ

افغانستان کے خلاف امریکہ اور اس کے حلیفوں کا ساتھ دینا، انہیں خفیہ معلومات مہیا کرنا، انہیں سامان رسد بہم پہنچانا، اپنے ہوائی اڈے ان کے سپرد کرنا، ڈرون حملوں پر خاموش رہنا، ذلت آمیز شرائط پر ان کی مالی امداد قبول کرنا اور انہیں بلاقید وشمار ویزے جاری کرنا۔۔۔ یہ سب پرویز مشرف اور اس کے بعد موجودہ حکومت کے وہ اقدامات تھے جنہوں نے پاکستان کی خودمختاری کا خاتمہ کرکے اسے امریکی کالونی بنانے کی راہ ہموار کی اور اب سانحہ ایبٹ آباد نے تو کسی ممکنہ خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی اور پاکستان کی خودمختاری پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ عوام وخواص چیخ اٹھے ہیں۔

ہم ملی مجلس شرعی کے علماء کرام اس صورت حال کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور موجودہ سیاسی و عسکری قیادت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ امریکہ کی نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ سے فی الفور دست بردار ہوجائیں جو درحقیقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ ہی کی ایک شکل ہے اور اس سلسلے میں امریکہ سے ہر قسم کا تعاون ختم کردیں اور اپنے داخلی حالات درست کرنے کی طرف توجہ دیں۔ ہمارے نزدیک آئندہ ایسے کسی سانحے سے بچنے کی واحد مؤثر صورت یہ ہے کہ عوام امریکہ نواز قیادت کا بوجھ سر سے اتار پھینکیں اور امریکی غلامی سے نجات کیلئے قومی خودمختاری کے ایک نکاتی ایجنڈے پر جمع ہوجائیں۔

## قرارداد ۲ توہین قرآن مجید

ملی مجلس شرعی کے سارے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کا یہ نمائندہ اجلاس بعض امریکی پادریوں کی طرف سے علی الاعلان قرآن حکیم جلانے کی اور امریکی حکومت کے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے اور ان کے خلاف ایکشن نہ لینے کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ اہل مغرب کی یہ گھناؤنی سازش ہے کہ وہ بار بار مسلمانوں کے مقدسات کی بے حرمتی کرتے ہیں، کبھی توہین رسالت کرتے ہیں اور کبھی قرآن حکیم کو جلاتے ہیں۔

اس قسم کے واقعات سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتہا پسند اہل مغرب اور ان کے حکمران

اسلام اور مسلمانوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں اور ان کے مقدسات کی بے حرمتی کر کے انہیں مشتعل کرتے ہیں تا کہ اگر وہ ردعمل ظاہر کریں تو ان کے خلاف انتہا پسندی اور دہشت گردی کا جھوٹا پروپیگنڈا کیا جا سکے حالانکہ ان کا یہ طرزِ عمل خود اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ان میں قوت برداشت موجود نہیں اور وہ خود انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔

ہم مسلم نمائندوں کی حیثیت سے امریکہ کے متعصب اور جنونی پادریوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ او آئی سی کے سربراہان اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی وسلامتی کونسل کے ذریعے ایسے واقعات کے سد باب کیلئے مؤثر قانون سازی اور ان پر فوری عملدرآمد کو یقینی بنائے۔ اجلاس حکومت امریکہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ دریدہ دہن پادریوں کو سخت سزا دے تا کہ آئندہ کسی کو مسلمانوں کی دل آزاری کی جرأت نہ ہو۔

## کمیٹیوں کا قیام

مجلس نے مستقبل کے کاموں کے لیے دو کمیٹیاں قائم کیں:

### کمیٹی برائے اتحاد بین العلماء

۱۔ مفتی محمد خان قادری　　۲۔ مولانا زاہد الراشدی　　۳۔ مولانا عبدالمالک
۴۔ مولانا عبدالغفار روپڑی　　۵۔ علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر

### کمیٹی برائے اصلاح میڈیا

۱۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ　　۲۔ مرزا ایوب بیگ　　۳۔ مولانا مجیب الرحمن انقلابی
۴۔ مولانا خلیل الرحمن قادری　　۵۔ ڈاکٹر محمد امین

## مدیر کے نام

ایسے دور میں جہاں باتیں بہت زیادہ ہیں، اور عمل بہت کم، باتیں بھی ایسی ہیں کہ ان سے امتِ مسلمہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس کے برعکس ان سے مزید انتشار پیدا ہوتا ہے، ایسے دور میں بہت کم رسالے ایسے ہیں جنہیں میں ذاتی طور پر اوّل سے آخر تک پڑھتا ہوں، انہیں قیمتی اثاثہ سمجھ کر اپنی لائبریری میں خاص جگہ دیتا ہوں، تاکہ مصر میں فخر کے ساتھ اپنے شاگردوں اور دوست احباب کو دکھاؤں، اور اسے پڑھ کر عربی ترجمے کے ساتھ سناؤں۔ آپ کا رسالہ (البرھان) انہی رسائل میں سرفہرست ہے۔ اسلام سے کامل وابستگی اور مسلمانوں سے خلوص ومحبت پر مبنی اداریہ اور قیمتی مضامین اس رسالے کا خاصہ ہے۔ سارے مقالے قارئین کو غور وفکر، سوچ بچار اور فکر وتدبر پر اُکساتے ہیں۔ اور ان کی معلومات میں اضافہ اور فہم و ادراک میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ (البرھان) مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار کررہا ہے۔ لہٰذا آپ کو (البرھان) تسلسل کے ساتھ نکالنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لیے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم السید
صدر شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی۔ قاہرہ

## اطباء اور طبی اداروں کی توجہ کے لیے

ڈاکٹر محمد امین صاحب کے تعلیمی ٹرسٹ کے پاس سوہاوہ کے قریب پوٹھوہار کے خوبصورت علاقے میں ایک ہزار کنال زمین تعلیمی مقاصد کے لیے موجود ہے۔ مجھے طب مشرق اور طب نبوی سے بہت دلچسپی ہے اور میں اسے اپنے لوگوں کے لیے بہت کارآمد و مفید سمجھتی ہوں۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ کوئی طبیب یا طبی ادارہ اس ٹرسٹ کی جگہ پر طبیہ کالج قائم کرے جس کے ساتھ کم از کم ۵۰ بیڈ کا ہسپتال ہو، ادویہ بنانے کی فیکٹری ہو، وسیع نباتاتی باغ ہو جس میں جڑی بوٹیاں اگائی جائیں اور ریسرچ سنٹر ہو۔ یوں اس پراجیکٹ کو طب نبوی کی تاریخ کی پہلی اور تاریخ ساز یونیورسٹی بنا دیا جائے۔

میری رائے میں اس جگہ یہ سارے کام نہ صرف خدمت کے جذبے سے ہو سکتے ہیں بلکہ مالی لحاظ سے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اطباء اور طبی ادارے اس امر پر غور فرمائیں اور ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کر کے اس نیک اور مفید کام کا جلد سے جلد آغاز کریں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اس پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا۔

پروفیسر شاہدہ چودھری
اقبال کالونی۔ سرگودھا

برائے رابطہ:
سراج محمود ناصر 0300-460 9522
ڈاکٹر محمد امین 0300-435 4673

## تالیفات ڈاکٹر محمد امین

## تعلیم و تربیت

| | صفحات | قیمت |
|---|---|---|
| ۱۔ **ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل۔ چند نظریاتی مباحث** (دوسرا ایڈیشن) | ۵۴۰ | ۲۵۰ روپے |
| اسلامی تناظر میں تعلیمی نظام کی تشکیل نو۔ ماڈل اسلامی سکول، یونیورسٹی اور نظام تعلیم کا عملی خاکہ ثنویت کے خاتمے کا طریق کار، نفاذ اسلام اور مسلم نشأۃ ثانیہ میں تعلیم کا کردار، وغیرہ | | |
| ۲۔ **ہمارا دینی نظام تعلیم** ☆ | ۳۱۴ | ۳۵۰ |
| دینی تعلیم کے چار وفاقوں کے ذمہ دار علماء سے طویل مشاورت اور مباحثے کے نتیجے میں دینی مدارس کے لیے اصلاحی تجاویز اور متبادل نصاب | | |
| ۳۔ **تعلیمی ادارے اور کردار سازی** | ۱۵۳ | ۸۰ |
| اس سوال کا جواب کہ جدید تعلیمی اداروں میں اسلامی نقطہ نظر سے بچے کی تربیت اور کردار سازی کیسے کی جا سکتی ہے؟ | | |
| ۴۔ **جدید اسلامی نصاب تعلیم** ☆ | ۲۳۱ | ۲۶۰ |
| پہلی سے بارھویں جماعت تک، سارے مضامین کے لیے، دینی اور عصری علوم کے امتزاج پر مبنی | | |
| ۵۔ **پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن** ☆ | ۴۲ | ۴۷ |
| ۶۔ **مطالعۂ قرآن وحدیث** (برائے جماعت اوّل تا پنجم) | ۲۴۰ | ۱۹۰ |
| ہر جماعت کے لیے الگ۔ مروجہ دینیات سے الگ اور زائد مطالعہ کے لیے | | |
| ۷۔ **بروشرز** | | |
| ۱۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام | ۱۲ | |
| ۲۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟ | ۱۶ | |
| ۳۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات | ۱۲ | ۵۰ |
| ۴۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام | ۱۲ | |
| ۵۔ والدین کے نام ایک اہم پیغام | زیر طبع | |
| ۶۔ نوجوانوں کے نام ایک اہم پیغام | زیر طبع | |

## تربیت و تزکیہ

| | صفحات | قیمت |
|---|---|---|
| ۱۔ **اسلام اور تزکیۂ نفس۔ مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ** | ۹۰۴ | ۶۰۰ |

تعمیر سیرت کا اسلامی منہج قرآن وسنت کی روشنی میں۔ مسلم ادارے اور تجربات۔ مغربی فکر وعمل سے ان کا موازنہ۔ ایک علمی، فکری اور تحقیقی تجزیہ

| | | |
|---|---|---|
| ۲۔ **ترکِ رذائل** | ۲۹۲ | ۱۹۰ |
| بُرے اخلاق، ان کے اسباب، نقصانات اور ان سے بچنے کے عملی طریقے | | |
| ۳۔ **حقیقتِ تزکیۂ نفس** (سوالاً جواباً) ☆ | ۵۵ | ۵۲ |
| مختصر، سادہ، عام فہم اور غیر اختلافی انداز میں اہم مسئلے کی وضاحت | | |
| ۴۔ **حقیقتِ تصوف** | ۸ | ۵ |

## قرآن وسنت

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ **سورہ یٰسین** | زیر طبع | |
| دورنگوں میں، بیک وقت تین تراجم (لفظی، بامحاورہ اور تفسیری) مع قرآنی عربی الفاظ کے اردو استعمالات کی نشاندہی کے | | |
| ۲۔ **Riyadh-us-Saliheen (2 Vols)** | ۱۴۵۴ | |
| ۱,۰۰۰ | | |
| حدیث اور تزکیۂ نفس کی معروف کتاب ریاض الصالحین اور اس کے حواشی کا انگریزی ترجمہ | | |
| ۳۔ **Noble Quran, Part 1** ☆ | ۷۰ | ۶۰ |
| قرآن حکیم کے پہلے پارے کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ | | |
| ۴۔ **Noble Quran, Part 2-9** ☆ | ۸۳۸ | ۹۳۸ |
| پارہ ۲ تا ۹ کا انگریزی میں لفظی ولغوی ترجمہ | | |

## فقہ وقانون

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون ☆ | ۲۷۳ | ۳۰۰ |
| ۲۔ **Islamization of Laws in Pakistan** | ۲۵۸ | ۲۰۰ |
| پاکستان میں مروجہ قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کا علمی تجزیہ، ضیاء الحق دور کا خصوصی مطالعہ | | |
| ۳۔ **السلطةالتشريعية۔دراسةمقارنة (عربی)** ☆ | ۱۶۹ | ۱۹۵ |
| اسلام میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے عمل کا تقابلی مطالعہ | | |

## مسلم امہ

۱۔ **مسلم نسأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل** ۴۰۷ ۲۵۰

اس اہم سوال کا جواب کہ مسلمان کس طرح زوال کے موجودہ گرداب سے نکل سکتے ہیں
اور کس طرح دوبارہ غلبہ وعروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ مکمل لائحہ عمل

۲۔ **اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش۔ ایک تجزیہ، ایک مطالعہ** (دوسرا ایڈیشن) زیر طبع

۳۔ **جہاد اور دہشت گردی۔ عصری تطبیقات** ۱۳۰ ۱۰۰

۴۔ **مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ** ۱۲ ۸

## سیاسیاتِ اسلام

۱۔ **اسلام اور پاکستان**☆ ۱۲۷ ۱۵۵

پاکستان میں نفاذ اسلام کا صحیح طریق کار

۲۔ **اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی**☆ ۱۳۳ ۱۴۰

۳۔ **سیاسی جماعتوں کی شرعی حیثیت**☆ ۴۵ ۵۰

۴۔ **اسلام اور جدید سیاسی مسائل** زیر طبع

## اسلام (متفرق)

۱۔ **رزم حق و باطل**☆

ان مسلم داعیوں اور حریت پسندوں کا تذکرہ
جنہیں کج فہم مسلم حکمرانوں سے کشمکش کرنا پڑی ۱۱۸ ۱۳۰

۲۔ **مقالاتِ امین (دو جلدیں)**☆ ۱۲۵۸

۱۳۵۰

ان مضامین و مقالات کا مجموعہ جو مختلف اوقات میں جرائد و اخبارات میں چھپتے رہے

۳۔ **عصر حاضر میں تعبیر دین** زیر طبع

۴۔ **ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت** زیر طبع

☆ فوٹو کاپی مہیا کی جا سکتی ہے۔

۔ خرید کتب کے لیے تحریک اصلاح تعلیم کے دفتر سے رابطہ کیجیے، فون نمبر 0300-4609522

۔ مندرجہ بالا قیمتوں میں ڈسکاؤنٹ شامل ہے ڈاک خرچ شامل نہیں جو موجودہ قیمت کا ۱۵% ہوگا۔

طریق ادائی: منی آرڈر یا پے آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، 71-A فیصل ٹاؤن، لاہور۔